عليكم انفسكم لا يضركم من ضل اذا اهتديتم

طلوعِ اسلام

اگست ۱۹۳۹

ایک روپیہ

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلہ

طلوعِ اسلام

مرتب محمد یونس

بدلِ اشتراک

سالانہ — دس روپے

ششماہی — چھ روپے

قیمت فی پرچہ

ایک روپیہ

-/-/1

جلد ۲ | کراچی ..... اگست سنہ ۱۹۴۹ء | نمبر ۸

فہرست مضامین

۱۵ اگست کا پیغام	۱
لمعات	۲
بقیہ لمعات	۵۶
تشکیل حکومت اسلامیہ	۹
سید حلیم پاشا (مرحوم)	
اسباب زوال اُمت	۳۳
(مشرقی حضرات)	
مسلم لیگ کی سیاست	۴۸
علمائے ہند کا فیصلہ	۵۵
(محترم اسد ملتانی)	
مقتضات	۵۷
(شمس العلماء حافظ سید محب الحق صاحب)	
باب المراسلات	۶۲
(۱) تعدد الازواج	
(۲) تلاوت قرآن پاک	
(۳) صدقہ و خیرات	
رفتارِ عالم	۶۶

۱۵ اگست کا پیغام

"کوفہ کا عامل جب حضرت عمرؓ کے پاس آیا تو اس نے دیکھا کہ اسلامی حکومت کا امیر جو کی روٹی زیتون کے تیل کے ساتھ کھا رہا ہے۔ عامل نے کہا کہ آپ کے محروسہ علاقہ میں گیہوں کافی مقدار میں پیدا ہوتی ہے پھر آپ جو کی روٹی کیوں کھاتے ہیں؟

فاروق اعظمؓ نے فرمایا کہ کیا گیہوں اتنی مقدار میں پیدا ہوتی ہے کہ ہر مسلمان تک اس کی روٹی پہنچ جائے۔

اس نے کہا کہ اس کی ذمہ داری کون لے سکتا ہے؟

آپ نے فرمایا کہ مسلمانوں کا امیر اس وقت تک گیہوں کی روٹی کیسے کھا سکتا ہے جب تک ہر اس شخص تک جو اس کے علاقہ میں آباد ہے گیہوں کی روٹی نہ پہونچ جائے!"

اگر باایں نرسیدی تمام بولہبی است!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

زیر نظر پرچہ جب آپ کے ہاتھوں میں ہوگا تو آپ ایک جشن منانے سے فارغ ہو چکے ہوں گے اور دوسرا جشن منانے کی تیاریاں کر رہے ہوں گے۔ ایک "دینی" جشن، ایک "دنیاوی" جشن۔ ایک عید الفطر کا جشن اور دوسرا ۱۴ اگست کو جشن آزادی۔ طرب و نشاط کے مواقع اور جشن و مسرت کی تقاریب پر آلام و مصائب کے تذکرے اور دکھ اور درد کی داستانیں موزوں نہیں سمجھی جایا کرتیں۔ لیکن

دل کا خوں آنکھوں میں کھنچ آئے تو کیا اس کا علاج!
نالہ رو کا کہتا کہ یہ پردہ در راز نہ ہو

وہ آنسو جو آنکھ کے آبگینے سے بے اختیار چھلک پڑے ہیں، ان کو خوننابہ دل کی طرف واپس لوٹا دینا کس کے بس کی بات ہے؟ جب سفینہ ہجوم مصائب اور انبوہ آلام سے تمام داغ داغ ہو رہا ہو تو اس ناسور کو رسنے سے کون روک سکتا ہے۔ جشن و مسرت کے اس قسم کے ہنگامے تو بعض اوقات الشعور میں سوئے ہوئے المیہ نغمات کے لئے اُلٹے مضراب بن جاتے ہیں۔ اور جب کیفیت یہ ہو کہ

نغمے بیتاب ہوں تاروں سے نکلنے کے لئے

تو پھر ہمارے یہ دکھ بھرے گیت آپ کی طرب و نشاط کی محفلوں کو سوگوار بنا دیں تو ہم معذور ہیں۔

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں

اور حقیقت تو یہ ہے کہ آپ سمجھیں یا نہ سمجھیں

مرا رونا نہیں، رونا ہے یہ سارے گلستاں کا

اگر آپ اپنے آپ کو دھوکے میں رکھنا چاہتے ہیں اور جھوٹی ہنسی کا نام شگفتگی قلب و بشاشت نگاہ رکھ لیتے ہیں تو اس سے حقیقت تو بدل نہیں جائے گی۔

آپ ابھی ابھی جشن عید سے فارغ ہوئے ہیں۔ لیکن ہم پوچھتے ہیں (اور آپ سینہ پر ہاتھ رکھ کر ہمیں بتائیے) کہ کیا آپ نے کبھی سوچا بھی ہے کہ یہ آخر یہ عید ہے کیا اور اس تقریب کو کیوں منایا جاتا ہے۔ رمضان کیا ہے؟

اور روزے کس سے نہ کئے جاتے ہیں؟ اگر آپ نے ان امور کو کبھی درخور غور و تفکر نہیں سمجھا اور عید کی تقریب اس لئے مناتے ہیں کہ یہ اسی طرح سے منتی چلی آ رہی ہے تو کیا آپ کو یہ حق پہنچتا ہے کہ اسے فی الواقعہ جشنِ مسرت سے تعبیر کریں؟

قوم کے ایک کثیر طبقہ کی (جس میں غریبوں کی اکثریت ہوتی ہے) مذہب سے شیفتگی اور وابستگی کا اب تک یہ عالم ہے کہ گھر میں کھانے کو نہیں۔ حتیٰ کہ گھر تک بھی نہیں جس سر چھپانے کا آسرا ہو۔ جسم ناقوت سے بدن میں قوتِ مدافعت نہیں۔ جسم میں خون کا نشان تک نہیں۔ دن بھر چلچلاتی دھوپ میں مشقت کرتے ہیں تو بمشکل کام جو پیٹ نصیب ہوتا ہے۔ وہ بھی اتنا نہیں۔ یہ حالات ہیں اور مذہب سے وابستگی کی یہ کیفیت ہے کہ رمضان آتا ہے تو نہایت پابندی سے روزے رکھتے ہیں۔ سحری کے لئے اٹھتے ہیں تو بسا اوقات صرف پانی پی کر روزے کی نیت باندھ لیتے ہیں کہ گھر میں کچھ کھانے کو نہیں اگر کچھ ملتا ہے تو وہ سوکھی روٹی سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ یوں روزہ رکھتے ہیں اور دن بھر دھوپ میں محنت کرتے ہیں۔ شام کو انہیں دیکھئے تو ضعف و اضمحلال ان پر مردنی چھا رہی ہوتی ہے۔ افطار کے لئے انہیں نمک سے زیادہ کچھ نہیں ملتا۔ دن بھر کی کمائی سے بمشکل دال روٹی نصیب ہوتی ہے۔ رات کو گیارہ بارہ بجے تک نماز اور تراویح سے فارغ ہوتے ہیں۔ تین بجے پھر اٹھ بیٹھنا ہوتا ہے اور دن بھر سونے کے لئے کوئی وقت نہیں ملتا۔ ان حالات میں اللہ کے یہ بندے روزے رکھتے ہیں!

آپ سوچئے کہ جس قوم کا عزم ایسا راسخ ہو اور تکالیف برداشت کرنے کی ہمت ایسی کوہ شکن، وہ قوم دنیا میں کیا کچھ نہیں کر سکتی! لیکن مولوی ان کا خیال تک بھی اس طرف نہیں آنے دیتا۔ وہ انہیں یہ کہہ کر سلائے رکھتا ہے کہ یہ تمام "اعمال" تمہارے "اعمال نامہ" میں لکھے جا رہے ہیں۔ قیامت میں ان کا "وزن" ہوگا اور جس کا پلڑا بھاری ہوگا اسے جنت میں بھیج دیا جائے گا۔ باقی رہی یہ دنیا۔ سو دنیا مردار ہے اور اس کا طالب کتا۔ یہاں کوئی جس قدر ذلیل و خوار ہوگا، خدا کی نظروں میں اسی قدر مقبول و محبوب قرار پائے گا۔ یہاں جتنا غریب اور مفلوک الحال ہوگا وہاں اتنا ہی غنی اور مرفہ الحال ہوگا۔ یہاں کی دولت و ثروت کافروں اور "دنیا داروں" کا حصہ ہے جن کے لئے آخرت میں کچھ نہیں۔ وہ اس طرح امیروں اور سرمایہ داروں کا آلۂ کار بن کر ان غریبوں اور محتاجوں کو افیون پلاتا چلا آیا ہے اور وہی قوم جسے، ان ہی نماز اور روزوں کے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر، ملوکیت، برہمنیت اور سرمایہ داری کے ملعون نظام پر برقِ خاطف بن کر گرنا تھا، اس نظام کے استحکام و استبقاء کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ یہ وہ انسانیت کش حربہ تھا جو ہماری دورِ ملوکیت میں ایجاد ہوا اور اب ہزار برس سے متوارث و متواتر چلا آ رہا ہے اور "اسلاف کے مسلک" کا لیبل اپنے اوپر لگا کر مقدس و متبرک بن چکا ہے کہ جو اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے اس کی آنکھ نکال دی جائے۔ کوئی خدا کا بندہ اتنا نہیں سوچتا کہ جن "اعمال" کو خدا نے آخرت سے پہلے، اسی دنیا کی بہترین متاع کا ذریعہ قرار دیا تھا جن کے متعلق واضح اور غیر مبہم الفاظ میں بتا دیا تھا کہ ان کا لازمی اور حتمی نتیجہ

دنیا کی بادشاہت بھی ہے۔ جس کے حاملین کے متعلق برملا کہہ دیا تھا کہ دنیا کی کوئی قوت انہیں مغلوب نہیں کر سکے گی جس نظام کے متعلق ساری دنیا میں اعلان کر دیا تھا کہ یہ نظام، تمام دیگر نظام ہائے زندگی پر غالب ہو کر رہے گا۔ اور صرف تباہی نہیں دیا تھا۔ بلکہ اس قوم نے جس نے سب سے پہلے ان "اعمال" کو ضابطۂ زندگی بنایا تھا، انہوں نے دکھا دیا تھا کہ کس طرح چند سالوں کے عرصہ میں، ایک اونٹ چرانے والی، کھجوروں کی گٹھلیوں پر گزارہ کرنے والی صحرانشین قوم، قیصر و کسریٰ کے تخت و تاج کی مالک بن جاتی ہے۔ ان "اعمال" کے متعلق یہ کہا جا رہا ہے کہ انہیں دنیاوی جاہ و ثروت، عزت و تکریم دولت و حشمت، قوت و حکومت سے کوئی علاقہ نہیں۔ یہ سب شان و شوکت جھوٹے نگوں کی مینا کاری ہے جو کافروں اور "دنیا داروں" کو جہنم کی طرف لیجانے کے لئے شیطان نے وضع کر رکھی ہے۔ "اللہ والے" وہی ہوں گے جو سب سے زیادہ خراب و خستہ حالت میں رہیں گے۔ یہ ہے وہ افیون جسے ملوکیت، برہمنیت اور قارونیت[۱] کی ملی بھگت نے وضع کیا اور جس سے قوم کے قوائے عملیہ کو اس درجہ مفلوج و مشلول کر دیا گیا ہے کہ اب وہ اسی موت کو عین زندگی اور اسی خواب کو عین بیداری سمجھ رہے ہیں۔

کہیئے کہ یہ مقام ماتم ہے یا ہنگام مسرت!

جب اُمت کے سامنے ان احکام قرآنی کی حقیقت بے نقاب تھی تو اس وقت یہی نماز اور روزے کیا نتائج مرتب کیا کرتے تھے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ۲ھ میں پہلی بار روزے فرض ہوئے۔ انہوں نے قوم کے اندر وہ انقلاب پیدا کیا کہ ابھی سترہ روزے بھی پورے نہیں کئے تھے کہ پوری کی پوری ملت (جو اُس وقت صرف ۳۱۳ نفوس پر مشتمل تھی) مخالفین کی متحدہ قوتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے بدر کے میدان میں پہنچ چکی تھی۔ روزے، قوم کی صلاحیتوں کو کس طرح بیدار اور اجاگر کرتے ہیں، اس کی شہادت بدر کے ذرات آج تک دیتے چلے آ رہے ہیں۔ یہ تھی روزہ داروں کی وہ جماعت کہ جب وہ اس طرح فاتح و منصور واپس لوٹی ہے تو اس انقلاب عظیم پر وجد و مسرت سے اپنے رب کے حضور والہانہ طور پر سجدوں میں گر گئی۔ اس تقریب کا نام تھا "جشن عید"۔ اس لئے کہ جس قوم کے ذمہ ساری دنیا سے ظلم و استبداد مٹا کر اس کی جگہ عدل و انصاف قائم کرنے کا فریضہ عائد ہو رہا ہو، ان کے جشن منانے کے انداز بھی دنیا سے نرالے ہوتے ہیں۔ ساری دنیا کا قاعدہ ہے کہ جشن فتح و کامرانی کو عیش و عشرت کے تنوعات سے منایا جاتا ہے۔ لیکن انہیں، اس موقع پر بھی یہ کہا گیا تھا کہ دیکھنا! فتح کی خوشی اور کامیابی کے غرور میں اپنے نصب العین کو نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دینا۔ اذا جاء نصر اللہ والفتح۔ جب خدا کی تائید و نصرت اور فتح کامرانی سے تم بہرہ یاب ہو۔

۱؎ یہ تذکرہ صاحب ضرب کلیم میں دیکھئے۔ فرعون، ملوکیت کا علمبردار، ہامان، برہمنیت (priesthood) کا نمائندہ اور قارون، سرمایہ داری کا مجسمہ ہے۔ اور ان تمام بتوں کو توڑنے کے لئے عصائے موسوی

فسبح بحمد ربک واستغفرہ۔ تو جوہر انسانیت کے سرچشمہ ربوبیت وارتقاء کی صمدیت میں اور جذب وانہماک سے سرگرداں ہوجاؤ (تسبیح) اور اس سے توفیق مانگو کہ تمہارے اعمالِ حسنہ کے نتائج تمہاری چھوٹی چھوٹی تدبیری کوتاہیوں کے اثرات کو زائل کردیں (استغفار)۔ انہ کان توابا۔ کہ اس کا قانون یہی ہے کہ جب تم غلط راہوں سے منہ موڑ کر صحیح رستہ پہ آجاؤ۔ تو ہر قدم پہ منزل قریب تر ہوتی جائے گی۔ (توبہ)۔ یہ تھا وہ اندازِ جشن ومسرت جو اس فاتح ومنصور قوم کو بتایا گیا تھا۔ یہ تھی پہلی عید اور اس کے چودہ سو برس بعد وہ عید جو فتحِ مکہ کے جشن کی تقریب میں منائی گئی۔ وہ مکہ جس سے یہی قوم، آٹھ سال پہلے اس طرح نکالی گئی تھی جس طرح تمہیں دو سال ادھر دہلی اور مشرقی پنجاب سے نکالا گیا تھا۔ ہم پوچھتے ہیں اس مشقت اور تکلیف سے روزے رکھنے والوں اور اس کے بعد جشنِ عید منانے والوں سے کہ کیا تمہارے روزے وہی نتائج پیدا کر رہے ہیں جو ان سے مقصود ومتصور تھے؟ اور اگر ان سے وہ نتائج پیدا نہیں ہو رہے تو کیا تمہیں کبھی اس طرف خیال کرنے کی ضرورت نہیں کہ ہماری اس قدر شاقہ محنت کیوں ضائع جا رہی ہے اسے نتیجہ خیز بنانے کے لئے کیا کیا جائے! یاد رکھئے! اس کا صحیح جواب آپ کو مولوی کے بے روح وفضول اور بے جان خطبوں سے نہیں ملے گا۔ کہ "مولویت"* اس نظامِ ملوکیت وسرمایہ داری کی مؤید ومبلغ ہے جس نے اس کی تخلیق کی تھی۔ اس کا صحیح جواب آپ کو ملے گا قرآن سے جو اس نظام کو مٹانے کے لئے آیا تھا۔

اس "دینی جشن" کے بعد اب آئیے اپنے "دنیاوی جشن" کی طرف جسے آپ جشنِ آزادی کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ قوموں کی زندگی میں بعض واقعات ایسے آتے ہیں جن کی یاد قائم رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ لیکن "یاد" کوئی بت نہیں ہوتی کہ اس کی پرستش کی جائے۔ یہ ذریعہ ہوتی ہے شعوری طور پر اس انقلاب کو تازہ رکھنے اور آگے بڑھانے کا جس کی یاد قائم رکھی جاتی ہے۔ مسلمانانِ ہند کی ملی زندگی میں اسی قسم کا ایک انقلاب آفریں دن آیا جسے ہم یومِ آزادی کہہ کر پکارتے ہیں۔ یہ دن درحقیقت ایک حدِ فاصل تھا ہماری گزشتہ اور آئندہ زندگی میں۔ یہ دن تھا اس عہد کا کہ ہماری آنے والی زندگی گزشتہ زندگی سے یکسر مختلف ہوگی۔ ہماری گزشتہ زندگی تھی غیروں کے بنائے ہوئے نظام کے تابع چلنے کی۔ وہ نظام جو موجب تھا ہماری انفرادی اور اجتماعی خیانتوں کا۔ جو ذمہ دار تھا ہماری فاقہ کشی اور فلاکت زدگی کا۔ جو سبب تھا ہمارے اخلاقی تسفل اور تعلیمی تنزل کا۔ جس نے ہمیں انسانیت سے یکسر بے بہرہ بنا رکھا تھا۔

---

* واضح رہے کہ مولوی سے ہماری مراد کوئی خاص شخص یا اشخاص کی جماعت نہیں بلکہ یہ اس ذہنیت کا نام ہے جو ہمارے دورِ ملوکیت میں پیدا ہوئی اور جس نے شعوری اور غیر شعوری طور پہ اس نظامِ زندگی کو پھر سے زندہ اور مستحکم کردیا جسے مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا۔ یہ ذہنیت بتقلیدِ آبا کی اندھی روش سے متوارث چلی آرہی ہے اور اس کے مظہر کا نام ہے مولوی۔

جس نے انسانوں کی دنیا کو درندوں کا بھٹ بنا رکھا تھا۔ جس میں ہر سرمایہ دار غریبوں کی محنت کے اثمار و نتائج پر سانپ بن کر بیٹھا رہتا تھا۔ جس میں مزدوروں کے خون کی سرخی، ارباب ثروت کے عشرتکدوں کی رنگینی کا سامان فراہم کرتی تھی۔ جس میں ان کی ہڈیاں امراء کے تفریحیش کے لئے چونہ بنتی تھیں۔ وہ نظام جس نے ہمیں انسانیت سے بہت نیچے گرا کر حیوانیت کی سطح پر لا کھڑا کیا تھا۔ بلکہ اس سے بھی نیچے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ وہ نظام جس نے ہمیں خیر و برکت کے سرچشمہ ابدی (رواتِ خداوندی) سے بہت دور پھینک دیا تھا۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کا دن اس اعلان کا دن تھا کہ جاء الحق و زھق الباطل۔ وہ انسانیت سوز نظام ختم ہوا اور اب اس کی جگہ ایک نئے نظام کا دور شروع ہوا جس کا سرنامہ "احترام آدمیت" ہے۔ کسی کو اس اعلان میں شبہ ہو تو ہو، لیکن یہ حقیقت ہے کہ قوم نے اس اعلان کو بالکل یہی سمجھا تھا۔ اس نے دس سال اسی "اعلان" کی خاطر جد و جہد کی تھی۔ ہم نے اپنے دعوے کی بنیاد اسی اعلان پر رکھی تھی۔ اس لئے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کا دن اسی اعلان و اعلام کا دن تھا۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۸ء کا دن اسی اعلان و اعلام کا دن تھا۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۸ء کو اس کی پہلی سالگرہ منائی گئی اور اب ۱۵ اگست ۱۹۴۹ء کو دوسری منائی جا رہی ہے۔

ہم کسی تفصیل میں جائے بغیر پاکستان کے تمام اصاغر و اکابر سے خدا کے نام پر پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا فی الواقعہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کا دن تمہاری پہلی اور بعد کی زندگی میں حد فاصل بن گیا تھا اور کیا اس کے بعد ان دو برسوں میں تم نے اس حد سے دو قدم آگے بڑھائے ہیں؟ اس کا جواب باہر سے نہ مانگئے۔ خود اپنے دل سے مانگئے۔ اقرأ کتٰبک کفی بنفسک الیوم علیک حسیبا (۱۷/۱۴)۔ اپنا "اعمال نامہ" پڑھو۔ کہ یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے ۔۔۔ اور پھر کسی اور سے شہادت طلب نہ کر۔ بلکہ اپنے آپ سے پوچھ کہ آج خود تیری ذات تیرے محاسبے کے لئے کافی ہے۔ یوں محاسبہ کر اور پھر سوچ کہ کیا تیری غیرت گوارا کرتی ہے کہ تو اس مزعومہ "حد فاصل" کی یاد میں جشن مسرت منائے؟ اگر تمہارا دل فی الواقعہ گواہی دیتا ہے کہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کا دن، ہماری زندگی میں ایک حد فاصل بن گیا تھا اور اس کے بعد ہم اس حد سے برابر آگے بڑھتے جا رہے ہیں تو تمہیں زیب دیتا ہے کہ اس دن کی یاد میں چراغاں کیجئے، جشن منائیے۔ ساری دنیا کو اس انقلاب عظیم پر دعوتِ فکر و نظر دیجئے۔ اپنی آنے والی نسلوں کے سامنے سر اٹھا کر چلئے۔

لیکن

اگر آپ کا دل اس کی گواہی نہیں دیتا تو اپنے آپ کو دھوکے میں نہ رکھئے کہ یہ دھوکا تمہیں اپنوں اور بیگانوں، سب کی نظروں میں ذلیل کر دے گا۔

ہے کوئی خدا کا بندہ ایسا جو اپنے دل کی سچی سچی گواہی کو ۱۵ اگست کے دن ساری ملت کے سامنے اعلانیہ پیش کر دے؟

تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن، اپنا تو بن!

طلوع اسلام کی اشاعت بابت فروری ۱۹۴۹ء میں حارث کے قلم سے مسٹر مسعود کی ہاری رپورٹ کا تذکرہ آچکا ہے۔ ملک میں چاروں طرف سے اس رپورٹ کی اشاعت کا مطالبہ ہوا اور بالآخر حکومت سندھ نے گزشتہ ماہ اس رپورٹ کو شائع کردیا۔

ہرچہ دانا کند، کند ناداں

لیک بعد از خرابیِ بسیار

جیسا کہ حارث نے اندازہ لگایا تھا، ہاری رپورٹ میں زمین پر انفرادی ملکیت کو ناجائز قرار دیکر زمین جوتنے والے کو زمین کی پیداوار کا کلی مالک قرار دیا گیا ہے۔ اور یہی اصول قرآن کے مطابق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ زمانہ کے بڑھتے ہوئے تقاضے خود ان غیر فطری آئین و قوانین کی تنسیخ کے مطالبے کر رہے ہیں جو انسانوں کی ہوس جاہ پرستی اور خون آشامی نے، اپنے عہد استبداد میں وضع کئے تھے اور جن پر پیشوائیت (priesthood) اور ملوکیت کی سازش سے شریعت کے مقدس نقاب ڈال دیئے گئے تھے تاکہ غریبوں اور مظلوموں کے دل میں ان قوانین کی اطاعت سے سرتابی کا خیال تک پیدا نہ ہو، کیونکہ اس سرتابی میں انہیں جہنم کے بھڑکتے ہوئے شعلے دکھائی دیتے تھے۔ مسٹر مسعود کی رپورٹ زمانہ کے ان ہی بڑھتے ہوئے تقاضوں کی بیباک ترجمان ہے اور مبنی علی الحقیقت۔

نظام سرمایہ داری ان تقاضوں کے "خطرناک نتائج" سے غافل نہیں رہ سکتا۔ اس لئے کہ ابلیس کو بھی آدم کے ساتھ ہی قیامت تک کے لئے مہلت ملی ہوئی ہے۔ وہ ایسے مواقع پر فوراً بھیس بدلنے کی کوشش کرتا ہے جس کا نام قرآن کی اصطلاح میں تلبیس حق و باطل ہے۔ چونکہ آج کل ملک میں عام رجحان "زمینداری" کے خلاف ہے اس لئے سرمایہ داری اب زمینداری سے ہٹ کر کارخانہ داری کی طرف رخ کر رہی ہے یعنی اب دلیل کا رخ یوں الٹتا ہے کہ ایک زمیندار کے لئے تو قطعاً جائز نہیں کہ وہ غریبوں کی محنت کا ماحصل خود لے جائے لیکن ایک کارخانہ دار (Industrialist) کے لئے غریب مزدوروں کا ماحصل شیر مادر کی طرح حلال ہے۔ زمینداری کو کارخانہ داری کی طرف منتقل کرنے کی ایک سعیِ زبوں حاصل کی مثال وہ رپورٹ ہے جو مسلم لیگ کی زرعی کمیٹی کی طرف سے حال ہی میں مرتب ہوئی ہے اور جس کا ملخص اخبارات میں شائع ہوا ہے۔ اس کمیٹی کی بڑی بڑی سفارشات یہ ہیں۔

۱) جاگیرداروں کو فوراً منسوخ کردیا جائے اور ان کا کوئی معاوضہ نہ دیا جائے۔

اس کے لئے یہ دلیل دی گئی ہے کہ

"جاگیریں اس معاوضہ کا نام ہیں جو انگریزی دور ملوکیت میں ان خدمات کے صلہ میں ملا جو ملت کے خلاف سرانجام دی گئیں۔ اب آزادی کے زمانہ میں دور ماضی کے اس کلنک کے

ٹھیکے کو ذرا مٹا دینا چاہیئے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ملت کو بیچ کر جو کچھ بھی حاصل کیا گیا ہو وہ سب کچھ اس قابل ہے کہ اسے ضبط کر لیا جائے۔ بلکہ حق تو یہ ہے کہ قوم کو ایک قدم اور بھی آگے بڑھانا چاہیئے۔ لیکن ہم پوچھنا یہ چاہتے ہیں کہ انگریزوں کے ماضی بعید کے ملت فروشوں کو سزا دیتے وقت، ہندوؤں کے ماضی قریب کے زمانے کے ان ملت فروشوں سے کیوں چشم پوشی کی جا رہی ہے جنہوں نے اوّل الذکر سے زیادہ ملت کو نقصان پہنچایا ہے۔ یہ قومیت پرست کا وہ طبقہ ہے جو ملت کی دس سالہ جنگ آزادی میں ساری قوم کے خلاف ہندوؤں کی ہمنوائی میں متحدہ قومیت (Nationalism) کا راگ الاپتا اور یوں مسلمان کہلاتے ہوئے مسلمان کی رگ جان کو کاٹنے کی فکر میں مضطرب و سرگرداں پھرتا تھا۔ اسی طبقہ کی ملعون کوششوں کا نتیجہ تھا کہ پاکستان کے ٹکڑے ہو گئے اور ملت پر وہ تمام تباہیاں آگئیں جن کے اثرات صدیوں تک بھی محو نہیں ہوں گے۔ تقسیم کے آخری لمحہ تک یہ طبقہ ملت کے خلاف سازشوں میں مصروف و نامت رہا لیکن حق انتخاب (Option) کے بپتسمہ سے ان کے سارے گناہ دھل گئے اور اب یہ لوگ نہایت طمطراق سے حکومت کی مسندوں پر فائز ہوگئے ہیں۔ ان مارہائے آستین کے متعلق محترم قائد اعظم مرحوم سے لیکر وزرائے کابینہ اور اعاظم قوم تک نے متعدد مرتبہ اعلانات کئے۔ لیکن کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ ان میں سے ایک کے متعلق بھی کوئی کارروائی کی گئی ہے؟ اور اب مسلم لیگ کی کیٹی کو بھی جب انگریزوں کے زمانے کے غداران ملت کے جبڈ نا پاک چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں تو ان کی آنکھ ان میں سے کسی ایک پر بھی نہیں پڑی! مجرم دونوں ہیں۔ بلکہ یہ "نیشنلسٹ مسلمان" تو اوّل الذکر سے بھی زیادہ سنگین مجرم ہیں کہ یہ ملت کی متاع بردہ کی بازیابی کی راہ میں سنگ گراں بن کر حائل ہو رہے تھے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ایک سے باز پرس ہو رہی ہے اور دوسرے سے چشم پوشی!

اب آگے بڑھئے۔ زمین سے متعلق سفارشات کا ملخص یہ ہے کہ

(۱) کاشتکار کا حق موروثی، حق ملکیت میں تبدیل کر دیا جائے بشرطیکہ وہ اس کا معاوضہ ادا کر دے۔

(۲) ۲۵ ایکڑ تک زمین خود کاشت رہنے دی جائے۔ لیکن ۵۰۰ ایکڑ قابل آبپاشی اور ۱۰۰۰ ایکڑ بارانی زمین پر انفرادی ملکیت کا حق برقرار رکھا جائے۔

(۳) اس سے زائد زمین، حکومت حاصل کر لے اور اس کا معاوضہ زمینداروں کو ادا کیا جائے جو پندرہ لاکھ روپیہ فی زمیندار سے زائد نہ ہو۔

جزئیات سے قطع نظر، ہم یہاں ایک اصولی بات اٹھانا چاہتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ زمینداروں کو ان کے حقوق ملکیت سے کیوں محروم کیا جائے؟

(بقیہ صفحہ ۔۔ پر دیکھئے)

تشکیلِ حکومتِ اسلامیہ

(سعید حلیم پاشا مرحوم)

سعید حلیم پاشا فاضل خاندان کا فرد تھا اور یہ خاندان دودمانِ خدیوی سے قرابت قریبہ رکھتا ہے۔ روشن خیال باپ کی عمر زیادہ تر جلاوطنی میں گذری اور آج بھی اُسے ترکوں کے خیالات میں جو انقلاب ہوا اس کے بانیوں میں شمار کرتے ہیں۔ سعید حلیم نے بھی جدید مغربی تعلیم پائی۔ وہ جس بے تکلفی سے عربی اور ترکی زبان بولتے اسی طرح فرانسیسی میں گفتگو کرتے تھے اور قریب قریب اتنی ہی قدرت انھیں انگریزی زبان پر حاصل تھی۔ بایں ہمہ اسلامی اور مشرقی طرز خیالات کا سررشتہ ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ انھیں ترکہ میں اتنی دولت ملی تھی کہ اگر وہ چاہتے تو عیش و عشرت میں زندگی گذارتے لیکن انھوں نے اپنے باپ کی فیض رساں طبیعت بھی ورثہ میں پائی تھی۔ وہ ترکی انقلاب ۱۹۰۸ء کے اصول کے بڑے حامی تھے اور ان کا اس کی حمایت میں صادق اور ثابت قدم ہونا اس بات سے ثابت ہے کہ جب ستمبر ۱۹۱۲ء میں نوجوان ترکوں کے ہاتھ سے اقتدار نکل گیا اور سعید حلیم پاشا کے طبقہ کا قریب قریب ہر شخص نوجوان ترکوں سے آنکھیں چرانے لگا تو اس وقت بھی انھوں نے اپنی مجلس اتحاد و ترقی کے معتمد اعلیٰ بنائے جانے سے انکار نہیں کیا۔

جنوری ۱۹۱۳ء کے مختصر انقلاب کے بعد وہ وزیر صیغۂ خارجہ اور پھر محمود شوکت پاشا کے شہید کئے جانے کے بعد وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ حکومت کے ہر رکن کے مارے جانے کا خوف تھا۔ ان کو اس قتل کے امکان سے ذرا بھی ہراس نہ تھا۔ دسمبر ۱۹۱۳ء میں انھوں نے وزارت خارجہ کا کام خلیل بے کے سپرد کیا اور فروری ۱۹۱۴ء میں خرابی صحت کی وجہ سے وزارتِ عظمیٰ کا عہدہ طلعت پاشا کے حوالہ کر دیا۔

انگریزوں کا استنبول پر (چند روزہ) قبضہ ہوا تو انھوں نے شہزادہ سعید حلیم کو گرفتار کر لیا اور مالٹا میں جلاوطن کر دیا۔ جہاں سے رہائی پانے کے بعد وہ روم چلے آئے۔ اسی شہر میں جانے کے زمانہ میں ایک نوجوان ارمنی کے ہاتھوں شہید ہوئے۔

بہ فروری ۱۹۱۸ء میں عہدے سے دست کش ہونے کا ذکر ہے کہ انھوں نے ترکی زبان میں اپنی شہرۂ آفاق کتاب "اسلام لشمق" (اسلامی بنانا) تصنیف کی جس کے لکھنے کا انھیں ایک مدت سے خیال تھا۔ شائع ہونے کے بعد اسے حیرت انگیز قبولیت حاصل ہوئی۔ مندرجہ ذیل مضمون شہادت سے کچھ ہی قبل انھوں نے فرانسیسی جریدہ "اوریان اے آکسی دان" کے لئے لکھا تھا اور ان کے انتقال کے بعد شائع ہوا۔ "اسلام لشمق" میں جن خاص خاص خیالات کو ظاہر کیا گیا ہے ان میں سے صرف ایک خیال اس فرانسیسی مضمون میں لیا ہے اور دوسرے ضمناً جستہ جستہ آگئے ہیں۔ جس خیال کو چنا ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی دنیا کے موجودہ انحطاط کا سبب یہ ہے کہ اسلامی اصول کی عملی تعبیر غلط یا ناقص طور پر کی گئی ہے پس اس انحطاط کا چارہ کار بھی یہ ہوگا کہ انھیں اصول سے زیادہ صحت اور دانائی سے کام لیا جائے نہ یہ کہ ہم اپنے انحطاط کا مداوا اس طرزِ حکومت اور اس طرزِ تمدن کی نقالی کو قرار دیں جس تمدن نے ان اسلامی اصول ہی کو سرے سے باطل اور ناقابلِ عمل ٹھہرایا ہے۔

شہزادہ سعید حلیم پاشا کا یہ مقالہ "جدید" اور عقلی بنیادوں پر شریعت حقہ کی حیرت انگیز تصدیق و ثبوت بہم پہنچاتا ہے۔ یہی وجہ یہ ہماری پوری غور و توجہ کا مستحق ہے۔ کیونکہ یہ احیائے ملت کا وہ راستہ بتاتا ہے کہ اسلامی دنیا اسے اختیار کرے تو کامیابی بالکل یقینی ہے۔

اسلامی قومیں اپنے خوابِ غفلت سے بیدار ہو رہی ہیں اور اغیار کے طوقِ محکومی کو اتار پھینکنے کی متمنی ہیں۔ اس بیداری اور احساس کے معنی یہ ہیں کہ بالآخر انھوں نے آزادی حاصل کرنے کے فریضہ کو جو ہر مسلم کا شریف ترین فرض ہے، سمجھ لیا اور جان لیا کہ بغیر آزادی کے کوئی مسرت اور حقیقی ترقی حاصل نہیں ہو سکتی۔ لیکن مسلمان تعلیم یافتہ طبقوں کے اکثر اکابر کو میں دیکھتا ہوں کہ وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ مغربی دنیا کے اصول اور تخیلات کو اختیار کئے بغیر ہمارے احیاء کی اور کوئی سبیل نہیں ہو سکتی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حضرات اب اس بات کا ادراک نہیں کر سکتے کہ دینِ اسلام نے جہاں خدائے واحد سبحانہ کی پرستش کا ہمیں سبق دیا ہے وہاں اخلاق و معاشرت کے اصول کا مکمل دستور العمل بھی ہمیں عطا فرمایا ہے، جس کا ماخذ و مصدر وہی عقیدۂ توحید باری تعالیٰ جل سلطانہ ہے۔ پس گمان ہوتا ہے کہ ہمارے "تعلیم یافتہ اعیان" کو اب اس بات پر کامل وثوق و اطمینان باقی نہیں رہا کہ نوعِ انسانی کا سب سے اچھا مذہب اسلام ہے۔ وہ مذہب کی سب سے اعلیٰ اور سب سے مکمل صورت ہے اور بمعنے جامع ترین معنی میں ایک تہذیب یا کامل تمدن ہے اور اسی لئے جس طرح اسلام سے ہٹ کر ابدی نجات ناممکن ہے اسی طرح تمدنی نجات بھی نہیں ہو سکتی۔

بظاہر یہ حضرات اس بات کو بھول گئے ہیں کہ جس طرح مسیحی دنیا کے تمام راستے "رومۃ" کو جاتے ہیں، اسلامی دنیا کے تمام شوارع کی منزل مقصود مکہ معظمہ ہے۔ ان دونوں ملتوں کا راستہ اور قبلہ آمال جدا ہے۔ اور نوع انسان کی عام ارتقا میں انھیں ایک دوسرے سے مختلف کام انجام دینا ہے۔

نظر بریں یہ سمجھنا فاش غلطی ہے کہ مسیحی دنیا نے اپنی سیاسی اور تمدنی ضروریات کے مطابق جو آئین و نظام مرتب کئے ہیں وہ ہمارے مناسب حال بھی ہو سکتے ہیں، خواہ ان میں ہم کتنی ہی ترمیم بھی کر لیں حقیقت میں ان ہر دو ملتوں کا فرق اتنا گہرا اور اصولی ہے کہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے متعلق انھیں ہم خیال بنانے کی کوئی کوشش کارگر نہیں ہو سکتی۔

یہ نئی ذہنیت جن آرائے فاسدہ سے مملو ہے میں انھیں دور کرنا چاہتا ہوں اور میرا مقصود یہ ثابت کرنا ہے کہ عمدہ اخلاق اور اصول معاشرت کے اعتبار سے اسلامی دنیا کو یورپ سے رشک کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے اس کے برعکس حقیقت میں خود مسیحی ممالک محتاج ہیں کہ اس معاملہ میں اسلام سے سبق لینے آئیں۔

اسلام کے اصولِ معاشرت۔ دین اسلام نے معاشرت کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ اس بنیادی عقیدے پر مبنی ہے کہ شریعت کے احکام اٹل ہیں۔ اسلامی تمدن وہ ہے جو ان احکام کے ماتحت ہو۔

شریعت، ان فطری، اخلاقی اور معاشرتی حقائق کا لب لباب ہے جو نبی کریم (علیہ التحیۃ والتسلیم) پر بذریعہ وحی الٰہی منکشف ہوئے اور ان پر انسانی فلاح کا انحصار ہے۔ اسی طرح شریعت کی فرمانروائی کے معنی یہ ہوئے کہ ہم ان اخلاقی اور تمدنی قوانین کی ماتحتی قبول کریں جن کا ماخذ خود فطرت ہے۔ اور اس لئے وہ ایسے ہی ناقابل تغیر اور آدمی کی رائے سے مافوق و آزاد ہیں جیسے قوانین طبیعی۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ ان قوانین کی نظر میں تمام انسان مساوی ہوں گے اور ان کی آزادی صرف اسی حد تک محدود و مفید ہوگی جس حد تک حکم و ارادۂ الٰہی کے ماتحت رہنے میں ضروری ہے۔ کیونکہ یہ قوانین اسی ارادۂ الٰہی کا ظہور ہیں۔ شریعت یا یوں کہو کہ شریعت کی فرمانروائی کا قانون بنا کے اسلام نے انسان کی سچی مساوات و آزادی کی بنیاد قائم کر دی اور ضمناً بنی نوع انسان کی حقیقی اخوت کا سبق دیا اور اس طرح تمدن کا سب سے افضل و صحیح تخیل پیدا کر دیا۔

شریعت کی فرمانروائی کا اصول ماننے کے معنی یہ ہیں کہ آدمی اس بنیادی حقیقت کو سمجھتا ہے کہ ہر وجود، خواہ اس کی نوعیت کچھ ہی ہو، بقا کے لئے اپنی فطرت کے مناسب، خاص خاص قوانین طبیعی کے ماتحت ہے اور اسی قاعدے سے نوع انسان کا تمدنی وجود بھی تمدن کے خاص خاص طبیعی قوانین پر منحصر ہے ٹھیک اسی طرح جس طرح اس کا جسمانی وجود جسم کے طبیعی قوانین کے ماتحت ہے۔ اس طور پر مذہب اسلام یہ اصول قائم کرنے میں کامیاب ہوا کہ کوئی انسان دوسرے انسانوں کے بنائے ہوئے قانون پر چلنے پر مجبور

نہیں ہے گو یہ قانون بڑی سے بڑی تعداد کے گروہ کی رائے سے بنایا گیا ہو کیونکہ ایسے قانون میں لازمی طور پر کچھ نہ کچھ خودرائی کا دخل ہوگا۔ بلکہ یہ کہ انسان پر صرف اپنے خالق سبحانہ کے حکم و ارادہ کی اطاعت فرض ہے جو قوانینِ طبیعی کی شکل میں ظہور پذیر ہوا۔

اس طرح اسلام نے تجربیات و عقلیات دونوں کو زیر کر لیا کہ یہ دونوں ہزارہا تعصبات اور ضلالتوں کا سرچشمہ تھے۔ اور ظہورِ اسلام سے قبل لوگوں کی تمدنی تنظیم کے طریقے انہی دو کی رہنمائی سے بنائے جاتے اور نشوونما پاتے تھے۔ اسلام نے وہ اصول تعلیم کئے کہ انسان ان فرضی حکومتوں کے قیدخانہ سے باہر نکل آیا جنھیں اس نے اپنے آپ پر اس لئے مسلط کیا تھا کہ یہ فطری ضرورت کسی طرح پوری ہو کہ کوئی قوت یا حکومت ملکی اور تمدنی اعتبار سے انسانوں کو حفظ امن اور قرینے کے ساتھ رکھ سکے۔ لیکن اس میں کسی کو حجت کرنے کی گنجائش نہیں ہو سکتی کہ اسلام ہی تھا جس نے حکومت کا صحیح تصور پیدا کیا اور اس کی اصلی قدر و قیمت لوگوں کو سکھائی۔ کیونکہ اسی نے یہ نکتہ انسان کے ذہن نشین کیا کہ حقیقی اور غیر متنازعہ فیہا حکومت کا سرچشمہ صرف خدائے واحد سبحانہ ہے اور اس حکومت کی عملی صورت وہ شریعت آسمانی ہے جس نے انسان کے باہمی حقوق و فرائض کا صحیح معیار قائم کیا۔ اسلام نے اس توہم کا خاتمہ کر دیا کہ انسان کی ضعیف عقل احکام و قوانین کا ماخذ ہے۔

جو کچھ اوپر بیان کیا گیا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ شریعت حقیقت میں ربانی تو ہے لیکن مافوق الفطرت نوعیت نہیں رکھتی جیسا کہ لوگ اکثر اسے ایک خرقِ عادت شے کی حیثیت سے پیش کیا کرتے ہیں۔ اس کے مافوق الفطرت نہ ہونے ہی کا سبب ہے کہ اسلامی نظام میں پیشوایانِ مذہبی کا کوئی مخصوص گروہ نہیں ہے دراصل شریعت خدائی دستور العمل ہے جو سراسر طبیعی قوانین پر مشتمل ہے۔ اگر شریعت کا کامل اتباع و احترام فرض ہے تو وہ اسی لئے کہ اس میں تمدنِ انسانی کی وہ حقیقتیں مدِنظر ہیں جنھیں خدائے علیم سبحانہ نے ہمیں سکھایا ہے اور جس کی قدر سب سے بڑھ کر اس بنا پر ہمیں ہونی چاہیے کہ صرف اسی سے ہمیں تمدنی مسرت و رفاہ میسر ہو سکتی ہے اور نیز اس لئے کہ اسی شریعت کی تعلیم دینے کے واسطے ایک نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو مبعوث کرنے کی ضرورت ہوئی جسے وحی الٰہی سے مشرف کیا گیا کہ اپنے بنی نوع کو پروردگار عالم سبحانہ کے مبارک منشا سے مطلع کر دے۔

عقلیت نے جھوٹے دعاوی اور فاسد اصول پرستی سے انسانی دماغ کو معطل اور فطری نشوونما کو مسدود کر رکھا تھا۔ لیکن اسلام نے انسان کے عالمِ افکار میں بنیادی انقلاب پیدا کر دیا جو مکمل اور قطعی تھا۔ طبائعِ انسانی میں اسی اسلام کے پیدا کردہ تغیر کی برکت تھی کہ آدمی کو اپنے دماغی قوتوں کی پرداخت اور ترقی دینے کا موقع میسر آیا اور وہ اپنے مشاہدے اور تدبر کی خداداد قابلیت سے پوری آزادی کے ساتھ کام لے سکا۔ یہی وہ تغیر ہے جس نے آدمی کو تجربی طریقے ایجاد کرنے کی راہ دکھائی اور اس طرح "علومِ جدیدہ" کی بنیاد ڈالی۔

تجربی علوم کے سب سے پہلے عالم، صحیح معنی میں مسلمان مخبرین تھے۔ وہ علم کے اصلی بانی اور شمع بردار تھے، اور ان کے کام نوعِ انسان کے ابدی فضل و شرف میں محسوب ہوں گے۔

یہ مغالطہ آمیز خیال کہ شریعت، مافوق الفطرت قوانین کا مجموعہ ہے اور جو لوگ بے چون و چرا اس کا اتباع کرتے ہیں وہ محض مذہبی سودائی ہیں، اصل میں اس لئے پیدا ہوا کہ شریعت کا مجموعۂ قوانین جن حقایق پر مشتمل ہے، ان حقائق کا علم ایسے طریقوں سے نہیں ہوا جیسے کہ دوسرے طبیعی علوم حاصل کرنے میں اختیار کئے جاتے ہیں، بلکہ یہ حقایق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کے ذریعہ منکشف ہوئے ہیں۔

لیکن یہاں اس سوال کا جواب دینا پڑے گا کہ شریعت بذریعہ وحی کیوں منکشف ہوئی؟ دوسرے قوانینِ طبیعی کے دریافت کرنے کے لئے انسان کے مشاہدے اور تعقل کی جو قوتیں کافی ہیں، وہ تمدن اور اخلاق کے قوانین دریافت کرنے میں کیوں قاصر رہیں۔ جواب اس کا بالکل سیدھا اور صاف ہے۔ ظاہر ہے کہ قوانینِ طبیعی کا آدمی کی جسمانی زندگی سے تعلق ہے۔ لہٰذا ان کی نوعیت خالص خارجی (Objective) ہے۔ برخلاف ان کے دوسری قسم کے قوانین انسان سے اس کے ذی عقل و ذی شعور اور متمدن ہستی ہونے کی حیثیت سے بحث کرتے ہیں۔ پس ان کی نوعیت نفسیاتی یا جذباتی قوانین کی سی ہے۔ یعنی وہ بداہۃً موضوعی یا ذہنی (Subjective) ہیں اور انھیں خود آدمی کا معین کرنا لایعنی اور محال ہے۔ بے شبہ آدمی کو وہ دماغی آزادی اور صحیح تمیز دی گئی ہے کہ جو واقعات و حوادث اس کے نفس سے باہر خود بخود ظہور میں آرہے ہیں، گو ان پر اس کی ذاتی قوتوں کا قابو نہیں۔ تاہم وہ ان سے صحیح نتائج کا استخراج کرتا ہے اور ان کے ایسے قوانین و قواعد مرتب کر سکتا ہے جو حقیقت واقعہ کے مطابق ہوں۔ لیکن ان بیرونی حوادث سے گذر کر جب خود آدمی کی عقلی اور تمدنی ہستی کا سوال پیش آتا ہے، یعنی جس وقت ہم ایسی مخلوق پر غور کرتے ہیں جو صاحب ارادہ، اپنے لئے خود کام کرنے والی، اپنے افعال نیک و بد کے خود قاعدے وضع کرنے والی ہے، تو اس وقت ہمارا مشاہدہ اور تعقل، خواہ کیسی ہی احتیاط اور سمجھ سے ان کا استعمال کیا جائے، شکوک اور عام طور پر گمراہ کن رہنما ہو جاتے ہیں، اس واسطے کہ جو شخص ان سے کام لے رہا ہے اس کے ذاتی نقائص و اسقام لازمی طور پر اس کے مستخرجہ نتائج میں نقص و فتور پیدا کر دیتے ہیں۔ اس دائرے کے اندر صحیح نتیجے تک پہنچنے میں آدمی کی فطری ناقابلیت اور معذوری کی ایک تعجب انگیز مثال یہ ہے کہ اہل یورپ اتنے کچھ متمدن اور مہذب ہو جانے کے باوجود ان قوانینِ اخلاق و معاشرت سے سخت جہل و بے خبری میں پڑے ہیں جو اصولِ فطرت کے مطابق ہیں اور اس حال میں کہ ان کی محنت نے انھیں دوسرے قوانینِ طبیعی کا ایک اعلیٰ درجہ کا علم عطا کیا ہے۔ غرض واقعہ یہ ہے کہ انسان اخلاق و معاشرت کے فطری قوانین کو جن پر انسانی خوشیوں کا انحصار ہے کبھی نہ جان سکتا اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی بذریعہ وحی تعلیم نہ فرماتے۔

علوم تجربی کا سیکھنا ہر مسلمان کا فرض ہے، اگرچہ اس کے لئے چین جانا پڑے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم علوم تجربی کو انسانی سود و بہبود کا ایک لازمی عنصر قرار دیتے ہیں۔ بہرحال اسلام کی تمدنی تعلیم کا منشا یہ ہے کہ آدمی کا فطری تمدن، یعنی وہ جو اخلاق و معاشرت کے فطری قوانین کے مطابق ہو، صرف وہ تمدن ہے جس کی عمارت شریعت کی کامل فرمانروائی کی بنیادوں پر تعمیر کی گئی ہو۔ اس تعلیم کا اصلی نکتہ یہ ہے کہ خود حکومت جس پر تمدن کا امن و پائیداری مبنی ہے، ایسے ماخذ اور سرچشمے سے نکلی ہے کہ اس کے ماننے میں کسی کو انکار و اختلاف نہ ہوا، نہ ہو سکتا ہے۔ یہ ماخذ خود کلام الٰہی ہے۔ اس پر حصر کئے بغیر چارہ نہیں کیونکہ خود انسانی تحقیق اور تجربہ ایسا ماخذ مہیا کرنے سے عاجز ہیں۔

علاوہ ازیں اسلام سکھاتا ہے کہ بہترین تمدن وہ ہے جس میں نفوس انسانی نہ صرف اخلاق و معاشرت بلکہ طبعیات کے قوانین کو بھی بہترین طریق پر جانتے اور ان سے کام لیتے ہوں۔ دوسرے لفظوں میں سب سے اچھے اور خوشحال بندے وہ ہیں جو خالق سبحانہ کی مبارک مرضی کی جمیع شرائط بجا لائیں اور اس میں کچھ شک نہیں کہ اسلام اس حقیقت پر بہت زور دیتا ہے کہ صرف اچھے اخلاق و اعمال سے جو خوشحالی یقینی طور پر میسر آتی ہے وہ کیسی ہی دیرپا اور حقیقی کیوں نہ ہو، نامکمل ضرور ہے۔ کیونکہ مادی پہلو محروم توجہ رہا۔ اسی طرح وہ خوشحالی جو محض قوانین طبیعی کے علم سے حاصل ہوتی ہے، گو اس میں مادی راحت و مسرت کے اسباب ہاتھ آجائیں تاہم باہمی معاشرت میں امن و اطمینان میسر نہیں آتا۔ حالانکہ یہی شے انسان کے قلبی لطف و راحت کی اصلی بنیاد ہے۔

قوم کی فرماں روائی (National Sovereignty) انسانی تمدن کے متعلق اسلامی اصول کی ایسی کھلی ہوئی فضیلت و برتری کے باوجود مسلمانوں کا طرز فکر ہمارے زمانہ میں کچھ ایسا فاسد ہو گیا ہے کہ وہ شریعت کی فرمانروائی پر قوم یا جمہور کی غیر ذمہ دار و مطلق العنان رائے کے اصول کو ترجیح دینے لگے ہیں۔ حالانکہ اس اصول کی پیدائش کو کچھ زیادہ زمانہ نہیں گذرا اور اس عرصہ میں بھی جہاں کہیں اس کا تجربہ کیا گیا وہ خطا سے منزہ ثابت نہیں ہوا۔ بات یہ ہے کہ مغربی تمدن کی مادی خوشحالی اور دنیاوی قوت سے بہت سے مسلمان ارباب فکر کی آنکھیں چندھیا گئی ہیں۔ وہ اس کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہیں اور جوش مسرت میں اس تمام ترقی کو قومی فرمانروائی کے اصول کی کرامت سمجھتے ہیں۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ قوم کی مطلق العنان فرماں روائی کا یہ اصول بھی ایسا ہی باطل و غلط ہے جیسے دوسری قسم کی فرمانروائیوں کے وہ اصول جن پر ممالک یورپ میں پہلے عملدرآمد ہوتا رہا ہے، کیونکہ یہ اصول ایک مفروضہ حق پر مبنی ہے جو قوم نے خود اپنی رائے اور فیصلے سے اپنے لئے مخصوص کر لیا ہے اور اپنے سابقہ خداوندان حکومت، یعنی کلیسا اور بادشاہ کی نقالی کی ہے جو اپنی اپنی باری سے اور محض خودرائی سے، اپنی

مطلق العنان وغیرذمہ دار اور منزّہ عن الخطا فرماں روائی کا نقارہ بجا چکے ہیں۔ نتیجہ ان فرمانروائیوں کا ہمیشہ یہ ہوا کہ قوت واقتدار کے لئے مسلسل کشاکش وجنگ ٹھن گئی۔ منافرت نے معاشرت کو تلخ وزہر آلود بنا دیا اور قوم کی طاقت بے سود خرچ ہوتی رہی۔ بذاتِ خود ان میں کوئی ایسی عقلی یا اخلاقی خوبی نہیں ہے کہ انھیں قابلِ قدر اصول مان کر لوگ ان کے آگے سر جھکا دیں۔ وہ محض غاصبانہ قوت یعنی ظلم وناانصافی کے مختلف پیرائے ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ اصل اور جائز حق ہمیشہ کسی فرض کی بجاآوری سے پیدا ہوتا ہے۔ وہ صرف فرض کی انجام دہی کا ایک معاوضہ ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو پھر یہ مفروضہ حقوق غصب وظلم ہیں۔

اکثر حضرات یہ دعویٰ پیش کیا کرتے ہیں کہ انسان ماں کے پیٹ سے بہت سے قدرتی حقوق لے کر پیدا ہوتا ہے اور اسی مجموعے میں ایک حق آزاد رہنے کا ہے۔ اس بات کو عام طور پر آزادی پسندی اور روشن خیالی کا ثبوت سمجھا جاتا ہے حالانکہ اس سے بڑھ کر غلط۔ اور میں عرض کروں گا کہ آزاد خیالی کے معارض کوئی دعویٰ نہیں ہو سکتا۔ آدمی کا کوئی "قدرتی حق" نہیں ہے۔ قدرت کی طرف سے اسے صرف یہ قابلیت عطا کی گئی ہے کہ اپنے آپ کو حالات گردوپیش کے موافق بنا لے۔ یعنی اس کی جسمانی اور روحانی یا اخلاقی زندگی جن قدرتی قوانین کے تابع ہے اس کا مشاہدہ کرے اور ان کے مطابق عمل کرے۔ بالفاظِ دیگر وہ فرائض ادا کرے جو ان قوانین سے اس پر عائد ہوتے ہیں۔ فرض کی انجام دہی سے اسے بقائے زندگی کا حق حاصل ہوتا ہے۔ اعمالِ حسنہ سے وہ عزت کا مستحق ہوتا ہے۔ غرض اپنے تمدنی اور اخلاقی فرائض ہی کے ادا کرنے سے وہ ایک خاص حد تک آزادی کا حق کما سکتا ہے۔ اور اس آزادی کی قدروقیمت ٹھیک ان فرائض کی جو وہ انجام دے، حقیقی اخلاقی اور تمدنی قدروقیمت کے مطابق معین ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ اسلام نے شریعت کے ذریعہ انسان کو صرف ان ضروری اور اصولی فرائض کی تعلیم دی ہے جن کے تمام وکمال ادا کرنے کی بدولت اسے کامل اور جاودانی مسرت سے بہرہ مند رہنے کا حق میسر آتا ہے۔

قوم کی فرمانروائی ایک غلط خیال کے ارتقا سے وجود میں آئی ہے اور یہ ارتقا کا سلسلہ آگے چل کر اسے بھی اپنے سے پہلے اصول کی طرح ناپید وفنا کر دے گا۔ اس کے علاوہ وہ شے جسے جمہور یا قوم کی مرضی کہا جاتا ہے حقیقت میں صرف تعدادِ غالب کی مرضی ہے۔ حتیٰ کہ ممکن ہے وہ نصف افرادِ قوم کے ساتھ فقط ایک رائے کی بیشی سے حاصل ہوئی ہو جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ نہایت کم اکثریت ہے جس کے مقابلے میں اتنی بڑی اقلیت موجود ہے کہ قریب قریب اکثریت کے مساوی ہو سکتی ہے۔ پس قوم کی فرمانروائی کا اصول ماننا گویا حقیقت میں یہ تسلیم کرنا ہے کہ تعدادِ اکثر اپنے سے کمتر تعداد کو زبردستی اپنی مرضی کا پابند بنانے کا حق رکھتی ہے اور یہ مرضی یا رائے بھی ایسی جو ہر معاملے میں قانونِ حتمی کا حکم رکھتی ہے اور جس کے فیصلے کا کوئی مرافعہ اور داد فریاد نہیں۔

قرونِ گذشتہ میں یہی حقِ حکومت امرا یا دینی پیشواؤں کی تعدادِ قلیل کو حاصل رہ چکا ہے اور وہ

اپنی رائے اور خوشی کے مطابق اس حق سے ناجائز کام لیتے رہے ہیں تم یقیناً تسلیم کروگے کہ قومی رائے کی حکومت اصل میں ایک انتقام ہے جو اکثریت، قلیل تر تعداد سے لے رہی ہے مگر اس کا نتیجہ بھی یہی ہوتا ہے کہ یہ انتقام آئندہ کسی دوسرے انتقام کا راستہ تیار کرے۔

قوم کا اظہار رائے کرنا یقیناً اپنے ایک حق سے کام لینا اور ایک ملکی فرض کو ادا کرنا ہے اور اس لئے اس کا کافی احترام اور لحاظ ہونا چاہیئے۔ لیکن اظہار رائے کا ہم کتنا ہی ادب ملحوظ رکھیں یہ ہرگز فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ دنیا میں جو چیز وجود رکھتی ہے خواہ اس کا تعلق تمدن سے ہو، خواہ جسمانیات سے وہ قوانین فطرت کے تابع ہے اور یہ کہ انسانی ارادہ و رائے کو ضرور ان قوانین کی رہنمائی قبول کرنی چاہیئے جو ہر شے پر حکمراں ہیں — مآل اندیشی اور دانائی یہی ہے کہ آدمی کی رائے ان فطری قوانین کے موافق اور ہم آہنگ ہو۔ پھر جس طرح طبیعیات کے میدان میں قومی رائے کی حکومت اور مطلق العنانی نہیں چلتی اور قوم و جمہور سب مجبور ہیں کہ طبیعی قوانین کے آگے سر اطاعت جھکائیں تو اخلاق و تمدن کے میدان میں قومی رائے کی فرمانروائی اور خود مختاری کا دعویٰ کس طرح جائز ہوگا۔ لہٰذا شریعت کی فرمانروائی پر ایمان لانا ناگزیر ہو جاتا ہے اور قومی فرمانروائی ایک ثانوی حیثیت اختیار کرتی ہے اور اس پر واجب ہو جاتا ہے کہ شریعت کی اطاعت و احترام کرے۔

شریعت کی فرمانروائی کے نتائج:۔ شریعت کی فرمانروائی کا اصول تسلیم کرنے سے نہایت اہم نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ ان سے تمدن و معاشرت کی پوری عمارت بالکل نئی بنیادوں پر تعمیر ہوتی ہے، جو اُسے دوسرے تمدنوں سے صاف صاف متمائز کرتی ہے۔

اسلام کے اس تمدنی کام کا خلاصہ چند الفاظ میں یہ ہے کہ اس نے ایک نظام معاشرت تیار کیا جس میں مختلف طبقات آبادی کی کوئی کشمکش باقی نہیں رہتی اور مساوات کا دعوے کرنے کی کوئی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔ یہ وہ نظام معاشرت ہے جس نے بنی نوع انسان میں سب سے پرخلوص اور سچا رشتۂ اتحاد قائم کیا اور ملک کے ملک اور قوموں کی قومیں اپنی آغوش میں لے کر "اسلامی برادری" کو وجود میں لایا کہ آج تک دنیا میں اس قسم کی کیفیت دیکھنے میں نہیں آئی نہ ایسے نظام کی کوئی نظیر ملتی ہے جس نے تقریباً چالیس کروڑ نفوس انسانی کی ایک دنیا کی دنیا کو جس میں بالکل مختلف نسل اور بعید ترین ممالک کے لوگ شامل ہیں اس طرح ایک رشتۂ اتحاد میں باندھ رکھا ہو۔ مزید برآں اسلام میں یہ قابلیت تھی کہ تمام اقوام جو اس کے دائرہ میں آئیں، اس نے انہیں ایک مستقل مطمح نظر عطا کیا اور وہی ہمیشہ ان کے ارتقاء کی صدارت و رہنمائی کرتا رہا۔

اسلام کے نظام تمدن کے قائم ہونے سے ایک اور نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کو ایسا وقار و اقتدار میسر آگیا جو پہلے کہیں اور کسی زمانے میں اس کا حصہ نہ تھا۔ کیونکہ اسلام ہی نے حکومت کو قابل خوف اور لائق احترام ہونے کے ساتھ محبوب شے بنایا۔ اس کی محبوبی کا باعث یہ کہ وہ شریعت کی ساختہ پرداختہ شریعت کی خادم

اور شریعت کے احکام رائج و نافذ کرنے والی تھی۔ اس طرح اس کے جواز میں کسی قیل و قال کی گنجائش نہ رہی اور اس پر غصب و قزاقی کے الزام کا کوئی شائبہ باقی نہ رہا نہ اس سے خوف کا سبب۔ اس کا نام لے لے کر لوگوں نے جو بدعنوانیاں یا غلطیاں کیں ان سے اس اعتقاد میں کبھی فرق نہ آیا جو حکومت کے متعلق دلوں میں جاگزیں تھا۔ ہر زمانہ میں اسلامی قومیں اسی اذعان و یقین پر جمی رہیں کہ جن مظالم اور خود رائی کے اعمال کا وہ شکار ہو رہی ہیں وہ ہرگز شریعت میں داخل نہیں۔ بلکہ یہ محض ایسے افراد کی شرارت و عصیان کے کرشمے ہیں جنھوں نے زبردستی حکومت پر قبضہ جما لیا اور قانون کے نام سے جو چاہا وہ کیا۔ ورنہ شریعت کے مقرر کئے ہوئے احکام و حکام کے جواز میں مسلمانوں کو اختلاف کرنے کا کبھی خیال تک نہیں آیا۔

عہدِ انحطاط پچھلی دو صدی سے ملتِ اسلامی کامل انحطاط کے عالم میں ہے۔ گو اسلامی اقوام شریعت کی فرمانروائی کے اس اصول کو اسی طرح مسلم جانتی اور تا مقدور اسلام کے برگزیدہ شعائر و احکام کی پیروی کر رہی ہیں لیکن اسلام کا عمل عہدِ ماضی کی طرح نتیجہ خیز نہیں نظر آتا۔ اس کا سبب بجز اس کے کچھ نہیں کہ اسلامی قومیں اپنے فرائض کو اسی طرح ٹھیک ٹھیک ادا کرنے کی قابلیت نہیں رکھتیں جیسی پہلے رکھتی تھیں۔

لوگوں نے ملتِ اسلامی کے زوال کے عجیب عجیب اسباب بیان کئے ہیں جو کم و بیش غلط اور بے سروپا قیاس آرائیاں ہیں۔ معاندینِ اسلام تو یہاں تک بڑھے کہ انھوں نے خود رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے قوانین کو اس زوال کا سبب قرار دیا۔ حالانکہ ایسا کہنا نہ صرف تاریخی اور عقلی اعتبار سے باطل ہے بلکہ خود معترضین کا دل اس واہی خیال کو قابلِ اعتماد نہیں سمجھتا۔ تاہم یہ لوگ خواہ مخواہ بھی کہے جاتے ہیں کہ جب تک مسلمان اپنے مذہب پر قائم رہیں گے اس وقت تک دوسروں سے اسی طرح پست و کمتر رہیں گے۔ اسلام کے ان بغض و عداوت رکھنے والوں کی تردید کچھ دشوار نہیں، مگر میں ان لوگوں سے بحث و مباحثے میں وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا جو محض کورانہ تعصب اور قلبی سوءِ ظن میں مبتلا ہیں۔ میں صرف اس عدم قابلیت کو صحیح صحیح بیان کرنے پر اکتفا کروں گا جو دنیا کے مسلمانوں میں اپنے اسلامی فرائض پہچاننے کے متعلق پیدا ہو گئی ہے۔ ملت اسلامی کے زوال کا واحد سبب یہی عدم قابلیت ہے۔ اس کو معلوم کرنے سے ہم اپنے زوال کی صحیح نوعیت کا تعین کر سکیں گے اور اسی کے ساتھ اسے دفع کرنے کی تدابیر بتا سکیں گے۔

اس بارے میں ہمیں دو سوالوں کا جواب دینا ہے۔ ایک تو یہ کہ مسلمانوں کے زوال و ادبار کی علامتیں کیا ہیں؟ دوسرے وہ اسلامی فرائض کیا ہیں جنھیں اسلامی قومیں آج کل اتنی کامل پابندی سے ادا نہیں کرتیں جیسے پہلے کیا کرتی تھیں؟

یہ کہنا قرینِ انصاف نہ ہوگا کہ مسلمانوں میں آزادی، مساوات اور یکجہتی مفقود ہوگئی جب کہ ہم جانتے ہیں کہ مسلمانوں میں کسی ذات پات یا قوم و نسل کی لڑائی اور کشمکش جیسے پہلے نہ تھی آج بھی موجود نہیں ہے۔ بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس زمانے میں اسلامی اخوت پہلے سے بھی زیادہ نمایاں اور عملی صورت میں ظہور کر رہی ہے۔ شریعت کی توقیر و احترام میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا اور امتِ مسلمہ آج بھی اس پر پورا اعتماد اور ایمان رکھتی ہے۔ حقیقت میں اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس بارے میں اسلامی قومیں زوال و انحطاط کے باوجود مغربی قوموں سے زیادہ خوش نصیب ہیں جہاں کسی قسم کی حکومت لوگوں کے دل میں احترام و اعتبار پیدا نہیں کر سکتی۔ لیکن جس وقت ہم مادی یا معاشی حالت پر نظر ڈالتے ہیں تو بدنصیبی سے مسلمانوں کا حال دگرگوں نظر آتا ہے۔ اسلامی قوموں کی نکبت و پستی کا اصلی راز اور ان کے جگر کا ناسور یہی ہے۔ اس معاملے میں مغربی قومیں ان سے ہر طرح جیت ہی جیت میں ہیں بلکہ جس نسبت سے مغربی اقوام کی مادی خوش حالی اور زر و دولت کے اقتدار میں اضافہ ہوا ہے اسی نسبت سے اسلامی آبادیوں کی دولت گھٹتی ہے۔ اس معاملہ میں مسلمانوں کا حال فی الواقع قابلِ رحم ہے اور انھیں یورپ سے بہت کچھ سیکھنا ہے۔

افلاس نے مسلمانوں کو ناتواں کر دیا اور ساز و سامان کی کمی نے اس قابل نہ رکھا کہ وہ یورپ کے طالبانِ اقتدار و جاہ کی دراز دستی کا مقابلہ کر سکتے۔ پس انھیں محکومی کی جملہ آفتوں اور ذلتوں کو برداشت کرنا پڑا۔ بایں ہمہ مسلمانوں کو اپنے مذہب سے جو شیفتگی اور جوشِ عقیدت مندی تھا، ان تمام آفات و مصائب کے باوجود اس میں ایک لمحے کے واسطے بھی کمی نہ آئی جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دینِ اسلام کا لوگوں کے دلوں پر کیسا کچھ قبضہ اور اقتدار ہے۔

واضح رہے کہ مادی اقتدار اور خوش حالی ان لوگوں کا حصہ ہیں جو فطرت کے قوانین کو دریافت کرتے اور اس علم کے ذریعہ سے فطرت کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانا جانتے ہیں۔ لہٰذا مسلمانوں کے انحطاط کا اصلی سبب مسلمانوں کا وہ جہل ہے جس سے بچنے اور ہوشیار رہنے کی نبی کریم (علیہ الصلوٰۃ والتسلیم) نے اہلِ ایمان کو تاکید کی تھی۔

لیکن اسلامی قوموں کی حالت اس جہل کی بدولت کیسی ہی خراب اور قابلِ تاسف کیوں نہ ہو مطلق مایوسی کے لائق نہیں ہے۔ ان کا انحطاط، مادی اور اقتصادی ہے اور اس کا مداوا کچھ بہت دشوار نہیں۔ اخلاقی اور تمدنی اعتبار سے اسلامی نظام ساری مصیبتوں کو جھیل گیا اور قائم رہا اور یہ نہایت اہم حقیقت ہے جس پر ہم اپنے آپ کو مبارکباد دے سکتے ہیں۔

اہلِ خانقاہ

مسلمانوں کے انحطاط کا جو سبب ہیں نے تشخیص کیا ہے۔ اسلامی دنیا کی تاریخ سے اس کے قطعی شواہد فراہم ہوسکتے ہیں تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ اسلامی دنیا میں انحطاط کے آثار ٹھیک اس زمانہ میں نمودار ہوئے جبکہ مسلمانوں میں ایک خاص قسم کے "اہلِ مدرسہ" پیدا ہوئے۔ مسلمانوں کا مذہب دینی عقائد میں خواہ مخواہ موشگافیاں کرنے اور باریکیاں نکالنے کا قطعاً مخالف ہے اور یہی سبب ہے کہ اسلام میں پیشوایانِ مذہب کا کوئی خاص فرقہ نہیں۔ مگر مذکورہ بالا الائی گروہ نے یہ عقیدہ لوگوں میں پھیلا دیا کہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے طلبِ علم اور تحقیق وتلاش کی جو بار بار تاکید فرمائی ہے وہ صرف شریعت کے رموز وحقائق سے متعلق ہے۔ منشائے نبوی کی یہ تعبیر ایک قسم کی خود رائی تھی۔ کیونکہ شریعت کے اخلاقی اور تمدنی احکام بتانے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیہم اصرار فرماتے ہیں کہ ہم اپنی ذاتی کوشش سے جس قدر زیادہ ممکن ہو علم حاصل کریں اور اپنے آپ کو زیادہ واقف اور باخبر بنانے رہنے میں کبھی دم نہ لیں۔ حضور صلعم کا ارشاد ہے کہ علم وحکمت سے ہم اپنے دین کو اور بھی اچھی طرح سمجھ سکیں گے اور جس قدر زیادہ علم ہوگا اسی قدر بہتر عمل کرسکیں گے۔ اس تعلیم کا مبارک منشا یہ ہے کہ جس طرح حضور رحمۃ للعالمین نے شریعت کے ذریعہ سے ہماری اخلاقی اور تمدنی راحت و خوش حالی کا سامان مہیا فرمایا، اسی طرح آپ (صلعم) چاہتے تھے کہ ہم اپنی کوشش سے فطرت کے اسرار معلوم کرکے دنیاوی اور مادی خوش حالی سے بھی بہرہ مند ہوں۔ لیکن اہلِ مدرسہ اور اہلِ تصوف نے مسلمانوں میں رفتہ رفتہ ایسا رواج پایا کہ دماغوں پر انہی کا تسلط جم گیا۔ حالانکہ یہ سارا کام ان مصنوعی علماء کا تھا جو اپنے آپ مسلمانوں کے پیشوا بن بیٹھے تھے۔ بہر حال اہلِ مدرسہ کے اس غلبے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی دنیا کی قوانینِ فطرت کے مطالعہ سے دلچسپی روز بروز کم ہوتی گئی اور اس نے علوم طبیعی کو قریب قریب بالکل ترک کردیا۔ اس طرح مسلمانوں میں مادی قوت اور آسودگی کے حصول کی صلاحیت بتدریج مفقود ہونے لگی جس کی انھیں اس لئے احتیاج تھی کہ وہ آزادی سے رہ سکیں اور بیرونی حملوں سے اپنی خود مختاری کو بچا سکیں۔ بالفاظِ دیگر یہ کہنا کچھ غلط نہیں ہے کہ اپنے سیاسی اور اقتصادی زوال کے باعث خود مسلمان ہیں۔

اس اثنا میں کہیں کہیں بعض مسلمانوں نے قوم کو ابھارنے کی جو کوششیں کیں ان میں کچھ کامیابی نہ ہوئی اور ادھر اہلِ مغرب سے میل جول اور خاص کر ان کی پھیلائی ہوئی تعلیم کا یہ اثر پڑا کہ اسلامی دنیا کو یقین ہوگیا کہ شریعت کے قوانین زمانۂ حال کی مادی ترقی کے اسباب ولوازم سے تضاد و تخالف رکھتے ہیں۔ اس غلط اور تباہ کن خیال کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض لوگ تو یہ سمجھے کہ ہمیں اپنے اسلامی اخلاق اور تمدن برقرار رکھنے کی خاطر دنیاوی سود وبہبود پر لات مارنی چاہئے۔ یعنی قوانینِ شریعت پر سے قوانینِ ترقی کو

قربان کر دینا چاہیئے۔ اور ان کے برخلاف ایک گروہ نے یہ سوچا کہ عقلمندی اسی میں ہے کہ اپنے دنیاوی اغراض کے لئے شریعت کے قواعد و قیود کو بالائے طاق رکھ دیا جائے۔ حالانکہ درحقیقت دنیاوی صلاح و فلاح اور دینی قوانین نہ صرف باہم دمساز بلکہ ایک دوسرے کا تتمہ ہیں مگر ہمارے پہلے گروہ کو تو یہ امید تھی کہ دنیاوی سود و بہبود سے قطع نظر کر لی جائے گی تو اسلام کا وہی شاندار، گو بعید از زمانہ پھر عود کر آئے گا اور یہ لوگ اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ اخلاق اور تمدن کی بہتری کا لازمہ دنیاوی ترقی اور خوش حالی ہے۔ باقی دوسرا گروہ اس خیال میں رہا کہ شریعت کو فرمانروائی سے معزول کر کے وہ ایک نئے تمدن کی بنیاد رکھے گا، جو ترقی پذیر و طاقتور ہو۔ اسی سلسلہ میں اول اول مسلمانوں کو "تفرنج" یا مغربیت کے اختیار کر لینے کا خیال پیدا ہوا۔

یہ سچ ہے کہ اس دوسرے خیال کے حامیوں کی تعداد ہمیشہ بہت قلیل رہی۔ لیکن تعلیم یافتہ اور روشن خیال طبقے میں اسی کو غلبہ حاصل ہو گیا اور رفتہ رفتہ اس نے اسلامی آبادی کے افکار و کردار پر بہت کچھ اثر ڈالا جس کی ایک بڑی وجہ یہ ہوئی کہ فرنگی حکومت کے عمال اور نائبین نے اس گروہ کو دل کھول کے مدد دی۔ اس گروہ کے، مغربیت کی حمایت میں متفق اور سرگرم ہونے کی اصلی علت یہ تھی کہ اس کے اکثر افراد تعلیم کے لئے مغربی ملکوں میں گئے یا ایسے مدرسوں کے پڑھے ہوئے تھے جنھیں مغربی سلطنتوں نے ایک دوسرے کی رقابت میں اسلامی ملکوں میں قائم کیا تھا۔ کیونکہ انھیں فکر تھی کہ اسلامی دنیا میں اپنے خیالات کی تبلیغ و اشاعت کے ذریعہ جس طرح ہو سکے مسلمانوں پر اپنا اخلاقی اور تمدنی غلبہ قائم کریں تاکہ مغرب کا سیاسی اور اقتصادی اقتدار مضبوط ہو جائے۔ اس طرح مسلمان تعلیم یافتہ گروہ کی تربیت ایسی آب و ہوا میں ہوئی اور وہ ایک ایسے عالم میں پہنچ گئے جہاں سے مغربیت کی عینک کے سوا وہ اپنے مذہب کو نہ دیکھ سکتے تھے نہ اس کے متعلق کوئی رائے لگا سکتے تھے جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ان اخلاقی اور تمدنی حقائق کو پوری طرح سمجھنے کے قابل ہی نہ رہے، جن کی اسلام تعلیم دیتا ہے۔ یہاں تک بھی نوبت پہنچی کہ انھیں ان اخلاقی اور تمدنی اصول کی صداقت کا اعتقاد نہ رہا اور وہ ان کو حقارت آمیز بے پروائی سے دیکھنے لگے اور ان کے سخت مخالف اور معاند ہو گئے۔ اس طرح ہمارے یہ نام نہاد راہ نما مغربی رنگ میں رنگے جانے سے اصلی مرض کی طرف سے بالکل اندھے ہو گئے۔ خلاصہ یہ کہ ان صاحبوں نے اسلامی دنیا کی حالت کو جو پہلے ہی نازک ہو رہی تھی اور بھی پیچیدہ اور پریشان کن بنا دیا اور لوگوں کے عقائد کو اپنی پسند کے مطابق بنانے کی کوشش میں طبیعتوں کو اور بھی مکدر و متذبذب کر دیا۔

رہے شریعت کے طرفدار تو ان پر بلاؤں اور مشائخ نے تسلط جما کے غلط راستے پر ڈال دیا تھا

اور نفس کشی کے طریقوں سے انھوں نے مسلمانوں کے انحطاط کا تدارک کرنا چاہا۔ اس کا نتیجہ بھی کچھ حسب مراد نہیں نکلا۔ تاہم یہ اعتراف کرنا انصاف کا تقاضا ہے کہ اس گروہ کی بدولت اسلامی دنیا میں ایسے لوگوں کی ایک جماعت کثیر پیدا ہو گئی جس کا کام ہی یہ تھا کہ علوم شریعت کا مطالعہ اور ان پر غور و بحث کرتی رہے۔ اس نے اپنے دل و دماغ اور فہم و فراست کو انہی علوم کے سیکھنے اور سمجھنے کے لئے وقف کر دیا اور اسی کا ثمر تھا کہ شرعی تعلیمات کی بنیادوں پر ایک محکم علم تیار ہو گیا۔ یہ علم فقہ کے نام سے مشہور ہے اور بلاشبہ اخلاقی اور تمدنی علوم کے دائرہ میں انسانی دماغ کی سب سے ممتاز پیداوار ہے۔

اسلامی دنیا کے مرض کی، جو اس کے جسم و جان کو کھائے جاتا ہے اور ان اسباب کی جن سے یہ مرض پیدا ہوا تشخیص کرنے کے بعد اس کا علاج معلوم کرنے میں کوئی دشواری نہیں رہتی بلکہ صاف نظر آنے لگتا ہے کہ مسلمانوں میں جس شے کی کمی ہے وہ علوم تجربی کی تحصیل ہے۔ چونکہ یہ علوم اس وقت مغربی اقوام کے قبضے میں ہیں لہٰذا ان کے حصول کی خاطر ہمیں ان لوگوں کے پاس جانا پڑے گا مگر یہ نہایت ضروری ہے کہ ہمیں اس بات کا یقین ہو کہ صرف یہی شے ہے جسے ہم یورپ کی قوموں سے مانگنے جائیں گے کیونکہ گو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسلمانوں کا انحطاط روکنے کے لئے ہمیں مغرب کے تجربی علوم اور صنعتی عملیات سیکھنے ناگزیر ہیں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم ان معلومات سے کام بھی اسی طریق پر لیں جس طریق سے اہل یورپ نے کام لیا ہے خاص کر سرمایہ اور مزدوری کی تنظیم کے معاملے میں ہمیں ہرگز پیداوار کے ان دو عنصروں میں وہ تعلق قائم نہ کرنا چاہیئے جیسا کہ یورپ میں پایا جاتا ہے۔ مسلمانوں کو اپنے اقتصادی نظام کی تشکیل اور درستی اصول فقہ کے ذریعے سے کرنی چاہئے جس کی بنیاد شریعت پر ہے اور جس نے شریعت کے منشا اور مطالب کو پھیلایا ہے۔

یورپی قوموں سے اور خاص کر ان کے طرز تمدن سے حسن ظن، یورپ کی دنیاوی ثروت و خوشحالی دیکھ کر ضرور پیدا ہوتا ہے مگر قوموں کی مادی خوشحالی تو محض اس سرگرمی کا پھل ہے جو وہ صنعتی علوم کے میدان میں دکھاتی ہیں، یہ خوش حالی ان کے طرز تمدن کی بہتری کا ثبوت نہیں ہو سکتی حتیٰ کہ یورپ کے متعلق تو یہ کہنا کچھ غلط نہ ہو گا کہ ان تمدنی حالات کی وجہ سے نہیں بلکہ ان تمدنی خرابیوں کے باوجود وہاں اتنی ثروت و خوشحالی ہے۔

مغربی مدنیت

یورپ کی موجودہ قوموں کے تمدن پر شروع سے نظر ڈالئے اور ان کی مدنیت کے آغاز و ارتقاء کو دیکھئے تو معلوم ہو گا کہ اول اول ان میں پیشوایانِ مذہبی کا تسلط رہا۔ پھر بادشاہی یا دنیاوی اقتدار نے اس کی جگہ لی۔ رفتہ رفتہ وہ حکومت قائم ہوئی جسے

غلطی سے جمہوری یا قومی حکومت کا نام دیا گیا ہے اور جس کا وصف امتیازی یہ ہے کہ زمانہ حاضرہ میں تجارت پیشہ فرقہ اس حکومت پر بالکل حاوی اور مسلط ہو گیا ہے۔ یہ فرقہ نہایت محنتی لیکن بلند خیالی کی کمی کے باعث خود غرضی میں مبتلا ہے۔ اور حکومت پر اس کے اقتدار پا جانے کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ مغربی قوموں کی تازہ ترین ارتقائی منزل میں اقتصادی مسائل نے غیر معمولی اہمیت حاصل کر لی ہے۔ اور اخلاقی اور تمدنی مسائل پر کافی توجہ نہیں کی جاتی۔ حالانکہ انسان کی حقیقی راحت و مسرت کے اسباب پر نظر رکھئے تو یہ مسائل کہیں زیادہ ضروری اور لائق توجہ ہیں۔ بہرحال اس دوگونہ عمل سے مغرب کے جدید تمدن کی خاص نوعیت یہ ہو گئی ہے کہ ہر شخص کے دل میں عیش و عشرت کی زندگی گزارنے کی تمنا ہے اور اسے زیادہ سے زیادہ دولت حاصل کرنے پر ابھارتی رہتی ہے۔ اسباب مسرت، یعنی دولت کی تلاش میں آدمی ہر بات کو جائز سمجھنے لگا ہے۔ دوسری طرف اسی تمدن سے صنعت و حرفت کو حیرت انگیز ترقی ہوئی ہے جس کی کوئی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔ حتیٰ کہ مغرب کا سارا نظام تمدن ہی اب اس کی صنعت و حرفت کے بل پر قائم ہے۔

ممالک یورپ میں یہ کیفیت طبقہ متوسط کے سرمایہ داروں کی بدولت پیدا ہوئی۔ لیکن اس کا قیام طبقۂ ادنیٰ کی محنت مزدوری کا رہین منت ہے۔ یہی سبب ہے کہ مغربی تمدن میں مزدوروں نے سرمایہ داروں سے بڑھ کر نہیں تو ان کے برابر قدر و منزلت حاصل کر لی ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ یہ طبقہ ادنیٰ نہ صرف متوسطین (اہل سرمایہ) بلکہ تمام اہل ملک کو اپنی مرضی و رائے کا پابند بنانے کی کوشش کر رہا ہے اور چاہتا ہے کہ اس تمدن کے آئین و شعائر مٹا کر بن پڑے تو اپنے منشاء کے مطابق نئی تنظیم قائم کرے اور اس کا تمام کام مزدور طبقے کے ہاتھ میں ہو۔

یہ کہنا کچھ غلط نہیں ہے کہ مغربی ملکوں کا تمدنی ارتقاء اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مارنے سے مشابہ ہے کہ ناواقفیت میں کبھی کسی طرف نکل گئے۔ کبھی کسی طرف اور اناڑی پن کے ان تجربوں میں صرف وقتی ضروریات، ہنگامی حالات اور تعصبات ان کی رہنمائی کرتے رہے۔ اگر یہ کچھ درست ہے تو اس کا کھلا ہوا سبب یہ ہے کہ مغربی ملکوں نے کبھی تمدن کا کوئی مستقل مطمح نظر سامنے رکھنے کی فکر نہیں کی۔ مغربی دنیا نے ابھی تک اخلاق و تمدن کے صحیح اصول نہیں سیکھے ہیں۔ یعنی وہ اصول جن کی بنیاد فطرت کے ازلی قوانین پر ہے اور جو انسان کی اجتماعی زندگی کو محکم و مستقیم رکھنے کا واحد ذریعہ ہیں۔

نظام تمدن کا غیر مستقیم ہونا اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ اس تمدن نے قوم کے صرف ایک حصے کو رضامند اور باقی حصوں کو ناراض و نامطمئن کر رکھا ہے اور اس سے ایک کی بیجا پاسداری اور دوسروں کی حق تلفی ہوتی ہے۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ کوئی نظام تمدن جس قدر غیر مستقل اور نامستقیم ہو

اسی قدر وہ نامنصفانہ ہوگا۔ اور اس کی زیادہ شدت سے مخالفت کی جائے گی۔ وہ محض جبر و تعدی سے اپنے آپ کو قائم رکھ سکے گا اور انجام کار یہی ظلم و جور جو اسے اپنی بقا کے واسطے اختیار کرنے پڑے اس کو تباہ و برباد کر دیں گے۔ مغربی ملکوں میں حکومت کے ساتھ جو بلا وقفہ و سکون مسلسل جنگ ٹھنی رہتی ہے (حالانکہ حکومت انسان کی اجتماعی زندگی کے لئے ناگزیر ہے) اس کا راز یہی ہے۔

مغرب میں بادشاہی کی حکومت ہو یا کلیسا کی، دنیادار غالب ہوں یا مذہبی پیشوا، عمائد و اکابر قوم کا دور دورہ ہو یا جمہوری عوام کا، خواہ سرمایہ داروں کی جگہ اشتراکیت لے لے، خرابی وہی رہے گی اگرچہ اس کی شکلیں اور لباس دوسرا ہوگا۔ سابقہ بدعنوانیوں کی بجائے نئی بدعنوانیاں اور تازہ حق تلفیاں ظہور میں آئیں گی اور اپنی نوبت پر اس قسم کی برائیاں پیدا کر دیں گی جن کا خمیازہ آئندہ نسلوں کو بھگتنا پڑے گا۔

یہیں سے اس باطل خیال کی تردید ہوتی ہے کہ مغربی ممالک میں آدمی اس قدر آزادی سے بہرہ یاب ہے جو آج تک کبھی انسان کو حاصل نہ ہوئی تھی۔ حالانکہ درحقیقت خواہ کوئی ملک و قوم ہو آزادی اور مساوات کی مقدار ہمیشہ تمدنی توازن کی استقامت کے متناسب ہوا کرتی ہے۔ بہ الفاظ دیگر جس قدر کسی ملک میں عدل و حق رسی زیادہ ہے اسی قدر وہاں زیادہ آزادی اور مساوات ہوگی اب اگر مغربی قوموں کے مختلف طبقوں میں عداوت و رقابت کا اندازہ لگایا جاتا ہے کہ وہ وحشیانہ شدت کے ساتھ ایک دوسرے سے لڑنے پر کمربستہ ہو جاتے ہیں جس کا ہمیں آئے دن مشاہدہ ہوتا ہے تو یہ قطعی ثبوت ہے کہ ان قوموں میں آزادی اور مساوات ایسی کامل حالت میں نہیں ہے جیسی کہ ہمارے تعلیم یافتہ اہل الرائے سمجھے بیٹھے ہیں۔

ان مختلف مشاہدات اور موازنوں سے نتیجہ نکلتا ہے کہ مسلم اقوام کو کچھ ضرورت نہیں ہے کہ یورپ کے اخلاقی اور تمدنی اصول کو شریعت پر ترجیح دیں۔ شریعت کے قوانین ان مغربی اصول پر بدیہی فوقیت رکھتے ہیں اور اسلامی دنیا کے موجودہ انحطاط کو روکنے کے لئے شریعت سے روگردانی کے بجائے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ان شریعت کے قوانین کو زیادہ اچھی طرح سمجھیں اور زیادہ اچھی طرح ان پر عمل کریں۔

مغرب کا سیاسی نظام

تمام سیاسی نظامات کی طرح ممالک مغرب کے سیاسی نظام بھی وہاں کے تمدنوں سے پیدا ہوئے ہیں۔ پس جب یورپ کا نظام تمدن آگے چل کر بدلے گا تو اس کے سیاسی نظام بھی لازماً بدل جائیں گے اور یہ امر انہیں خواہ مخواہ ایسا ہی ناپائیدار اور تغیر پذیر بنا دے گا جیسا کہ وہ تمدن ہے جس سے یہ سیاسی نظام پیدا ہوئے ہیں

مغرب کا نظامِ سیاسی گلیتہً قوم کی فرمانروائی کے اصول پر مبنی ہے اور ایسا ہی ہونا بھی چاہئے تھا کیونکہ مغربی قوموں کو سوائے قوم کی رائے کے جو بلا روک ظاہر کی جائے اور کوئی ذریعہ اہلِ ملک میں حق اور انصاف سے کام لئے جانے کا میسر ہی نہیں آیا اور مزید معلومات یا تجربہ حاصل ہونے تک یورپ کی یہی کیفیت رہے گی۔ اسی اصول کے اختیار کرنے کا نتیجہ تھا کہ قومی نیابت کی بنیاد پڑی اور قومی نیابت کا آئین ہی مغربی تمدن کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

اب چونکہ مغربی قومیں، معاشرت کے اعتبار سے مختلف طبقوں میں منقسم ہیں اور یہ طبقے ایک دوسرے سے مختلف بلکہ اکثر اوقات مخالف منشا اور آرزوئیں رکھتے ہیں کیونکہ ان کی تمدنی ضرورتیں بالکل مختلف ہیں، لہٰذا شروع ہی سے قومی نیابت مخالف جماعتوں کی کشمکش کا اکھاڑا بن جاتی ہے۔ الگ الگ فرقے تیار ہوتے ہیں اور یہ سیاسی فرقے اگرچہ محض اپنے اپنے طبقات کی اغراض و مفاد کے جویا اور دلدادہ ہوتے ہیں تاہم دعوے یہی کئے جاتے ہیں کہ ہم ساری قوم کی بہتری میں ساعی ہیں۔ اس طرح یورپ کی مجالسِ ملکی (یا پارلیمنٹیں) مختلف طبقاتِ آبادی کی زور آزمائیوں کا دنگل بن گئی ہیں اور کبھی ایک سیاسی فرقے کو کبھی دوسرے کو یہ موقع بہم پہنچاتی رہتی ہیں کہ وہ حکومت پر قبضہ کرلے اور جب تک اس کا زور چلے صرف اپنے فرقے کا بھلا کرتا رہے۔ یہ ہے وہ خدمت جو قومی نیابت یورپ میں آجکل انجام دے رہی ہے۔ اور یہ جنگ اس وقت تک برابر ٹھنی رہے گی جب تک کہ مختلف طبقات میں عناد و رقابت موجود ہے۔ حقیقت میں مغربی قوموں کو اپنی سیاسیات میں امن اور باہمی اعتماد کی نعمت اس وقت میسر آئے گی جبکہ وہ اپنے تمدنی فساد اور عناد سے نجات حاصل کرلیں۔

قومی نیابت (National Representation) قومی فرمانروائی (National Sovereignty) کے عقیدے پر مبنی ہے اور جس طرح قومی فرمانروائی کو مطلق العنان ہونے سے عن الخطا اور قوت قاہرہ مان لیا گیا ہے اسی طرح اس کی آفریدہ قومی نیابت کے حقوق و اختیارات بھی بہت زیادہ وسیع ہیں بلکہ یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ ان اختیارات کی کوئی حد ہی نہیں۔ کیونکہ یہ قومی نیابت، وضعِ قوانین کا اجارہ رکھتی ہے یعنی صرف اسی کو یہ حق حاصل ہے کہ قوم کی منشا کا اظہار کرے اور قوانین کی صورت میں قوم کو اس منشا کا پابند بنائے۔

قومی نیابت کا سب سے بڑا کام ملک میں جمہوریت کو مسلط کرنا ہے اور اس جمہوریت کے معنی سوائے اس کے کچھ نہیں ہیں کہ قلت تعداد کو اکثریت کی مرضی کا محکوم بنایا جائے اور ادھر قومی نائبین یا مبعوثین کو ملک پر نگرانی رکھنے کا جو اختیار دیا گیا ہے وہ نظم و نسق میں عقل و دیانت سے کام کرنے کی بجائے مبعوثین کی ذاتی اغراض میں صرف ہوتا ہے۔ جماعت عاملہ بھی اپنے اصلی مرتبہ سے تنزل

کرکے بالآخر محض ان اشخاص یا فرقوں کی ذاتی اغراض پوری کرنے کا آلہ بن جاتی ہے جو مجلس مجوزین میں اس کا آسرا بنے ہوتے ہیں۔ وہ عمدہ اور بڑی بڑی تنخواہوں کے عہدے ایجاد کرتی اور اس طرح بانٹتی ہے کہ اس کے سرپرستوں کے لئے اور مددگار پیدا ہو جائیں اور انتخابات کے موقع پر ہر ممکن ذریعے سے کوشش کرتی ہے کہ اس کے سرپرستوں اور حامیوں کی تعداد غالب رہے۔ وہ ہر قسم کی بیجا رعایت یا مصالحت پر رضامند ہو جاتی ہے اور نہ صرف نظم ونسق کو بھلاتی اور گرا دیتی ہے بلکہ اس میں فساد و خرابی پیدا کرتی ہے۔ غرض اس قسم کے سیاسی نظام میں جماعت عاملہ یا حکومت اچھا نظم ونسق کرنے کے بجائے زیادہ تر جوڑ توڑ ساز و باز میں مصروف رہتی ہے، اس کے علاوہ وہ سیاسی نظام جس میں وضع قوانین کا حق، کسی ایک سیاسی فرقے کی مٹھی میں آجائے ہمیشہ ناقص اور نامناسب ہوتا ہے کیونکہ وہ فرقہ صریحاً خود رائے اور عدل و انصاف کی طرف سے غافل ہوگا اور قانون سازی گویا حقیقت میں جور و جبر کا محض ایک آئینی ہتھیار بن جائے گی۔ شخصی مفاد یا فرقے کی اغراض کو پیش نظر رکھ کر قوانین وضع کئے جائیں گے اور وسیع و صحیح معنی میں ساری قوم کے فائدے کا پورا لحاظ نہیں رکھا جائیگا ان قوانین میں خواہ مخواہ ناانصافی اور بے جا رعایت کا دخل ہوگا۔ اس قسم کی سیاسی تنظیم کے ماتحت جو قومیں زندگی بسر کر رہی ہیں وہ انتہائی کوشش کرتی ہیں کہ قانون سے کام لینے والے، عدالت کے حکام ہر طرح کے برے اثرات سے آزاد اور محفوظ رہیں تاکہ قانون کی تعبیر و استعمال میں کوئی ناانصافی ہونے نہ پائے۔ لیکن اگر یہ قومیں اس بات کو جانتی ہیں کہ قانون سے کام لینے میں جیسی انصاف پسندی اور اعلیٰ علمی قابلیت درکار ہے اس سے بھی زیادہ انصاف پسندی اور فضیلت قانون وضع کرنے والے میں ہونی چاہئے، تو صاف ظاہر ہے کہ خود ان قوموں کو اپنے سیاسی نظام کے بدیہی نقائص اور خامیوں کا اعتراف ہوگا۔

یورپ کے سیاسی نظام کے اسقام و مفاسد کی فہرست بہت طویل ہے۔ لیکن اس نظام کی خرابیاں کتنی ہی سنگین کیوں نہ ہوں یہ سیاسی نظام اتنی خوبی ضرور رکھتا ہے کہ جس طرز تمدن کے ساتھ وجود میں آیا ہے اور اس کا سچا مظہر ہے وہ اس سے پوری مناسبت اور مطابقت رکھتا ہے وہ اگر ناقص ہے تو اس لئے کہ وہ ایسے تمدن کی ضروریات پوری کرنے کے لئے مرتب ہوا ہے جو بذات خود ناقص ہے اس کی صاف ظاہر ہے کہ ایسی قوم کے حق میں جس کی ضرورتیں مغربی اقوام کی ضرورتوں سے مختلف ہوں، یہ نظام سخت نقصان رساں ہوگا۔ دوسرے فی الواقع اسے اختیار کرنے کی کوئی وجہ بھی نہیں معلوم ہوتی۔

جو کچھ ہم نے اوپر بیان کیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ مرض جس سے اسلامی دنیا آزار پا رہی ہے قوانین طبیعی سے مسلمانوں کی جہالت کا نتیجہ ہے کیونکہ یہ جہالت انھیں فطرت کی نعمتوں سے محروم اور

دنیاوی عسرت و افلاس میں مبتلا رکھتی ہے اور ان کی سیاسی آزادی کی جڑوں کو ہلا دیتی ہے اس کے مقابلہ میں وہ مرض جو مغربی دنیا کو لاحق ہے۔ اخلاق و تمدن کے طبیعی قوانین کی جہالت سے پیدا ہوا ہے اور یہ جہالت اہل یورپ کو دائماً تمدنی تپ میں مبتلا رکھتی ہے۔ اس طرح اسلامی دنیا مادی خوش حالی سے محروم ہے۔ اور آخرالذکر (یعنی مغربی دنیا) تمدنی آسودگی سے بے بہرہ ہے۔

اس مرض سے نجات پانے کے لئے اسلامی دنیا کو لازم ہے کہ اس جہالت کا ازالہ کرے جو بیماری کی اصلی جڑ ہے۔ اس ازالہ کے لیے مسلمانوں کو خواہ مخواہ مغربی ممالک سے مدد لینی ہوگی جو اس معاملہ میں خوش نصیب ہیں اور علوم طبیعی پر ان کا قبضہ ہے۔ دوسری طرف اگر مغربی ممالک اپنے روگ کا علاج کرنا چاہتے ہیں تو اس کی بہترین سبیل یہ ہے کہ وہ اسلامی دنیا سے دستگیری چاہیں اور اخلاق و تمدن کے وہ قوانین مستعار لیں جن پر اسلامی شریعت مشتمل ہے۔

مسلمانوں کا سیاسی نظام

بہترین سیاسی نظام وہ ہے جو کسی قوم کے طرز تمدن سے بالکل موافق ہو۔ اس تمدن کے اصول کی عملاً بالکل صحیح تعبیر کرے اور ان اصول کو بہ کم و کاست ظہور میں لائے۔ اسلامی ملک یا تمدن وہ ہے جو شریعت کی فرمانروائی کے ماتحت ہو، بالفاظ دیگر یہ وہ تمدن ہے جس میں ہر شخص شریعت کے اخلاقی اور تمدنی احکام کی انفراداً پابندی کرتا ہے اور اسی کے ساتھ لحاظ رکھتا ہے کہ دوسرے لوگ یعنی پوری قوم بحیثیت مجموعی، ان احکام کی پابندی اور احترام کرے یہی ہر مسلمان کا وہ اسلامی فرض ہے جس سے لازمی طور پر ایک ناقابل انکار حق وجود میں آتا ہے اور وہ حق حکومت پر نگرانی رکھنا ہے۔ اس طرح مسلمانوں کا آئین حکومت لازماً جمہوری یا نیابتی ہوگا۔

لیکن اسلامی ملک میں آبادی کے طبقات باہم رقیب و معاند نہیں ہوتے اور لوگوں کا منشا اور تمدنی مقاصد یکساں ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس ملک میں قومی نیابت کی شکل مغربی ممالک سے مختلف ہوگی اور جس طرح اس کی تشکیل اور حقوق و امتیازات دوسرے ہوں گے اسی طرح اس کی غایت اور مقصود میں بھی یورپ کے ملکوں سے فرق ہوگا۔ اسلامی ممالک میں قومی نیابت کی خدمت ایک مجلس انجام دے گی جس کے ارکان کو قوم نے منتخب کیا ہو۔ مگر اس مجلس کے اجزاء ترکیبی لازمی طور پر ایسے ہوں گے جو کامل صلح و ہم آہنگی سے کام کر سکیں۔ یہ صلح و آشتی مختلف طبقوں کی اسی اخوت پر مبنی ہوگی جو ملت اسلامی کی ایک ممتاز خصوصیت ہے۔

اسلامی پارلیمنٹ میں اشتراکی، منزدی (کمیونسٹ) جمہوری یا بادشاہی پسند فرقوں کا کوئی وجود نہ ہوگا بلکہ صرف ایسے نیک نیت اشخاص جمع ہوں گے جن سب کا مقصد اور مطمح نظر ایک ہے۔ یعنی

مقدور بھر شریعت کے عاقلانہ احکام کی صحیح تعبیر و تبلیغ کرنا۔ ان لوگوں کا اختلاف جو کچھ ہوگا وہ ایک مشترک مقصد کے حصول کے وسائل منتخب کرنے میں ہوگا اسی لئے اسلامی ملک کے وکلاء یا مبعوثین کو ایک دوسرے پر فتح و غلبہ حاصل کرنے کے واسطے زور آزمائی کی ضرورت نہ ہوگی۔ وہ صرف ایک دوسرے کے مددگار رہوں گے اور سب مل کر ایک مشترک مقصد کی پیروی کریں گے۔

اس پارلیمنٹ کے حقوق و اختیارات بے شبہ اتنے وسیع ہوں گے کہ وہ حکومت عاملہ پر نہایت جزئی، نہایت مکمل اور نہایت کارگر نگرانی رکھے۔ لیکن اس پارلیمنٹ کو وضع قوانین کا منصب حاصل نہ ہوگا۔ سیاسی یا ملکی مبعوثین کو یہ حق تفویض کرنا منشاءِ شریعت کے موافق نہیں ہے کیونکہ شریعت کے احکام کی کامل دانشمندی اور عدل گستری اس بات کو جائز نہیں رکھ سکتی کہ محض سیاسی اشخاص کا گروہ، خواہ وہ کیسے ہی اعلیٰ اوصاف سے متصف ہوں وضع قوانین کے منصب سے سرافراز کیا جائے دوسرے وہ اسباب خاص جن کی بدولت مغربی ملکوں میں یہ حق پارلیمنٹ کو دیا جاتا ہے، اسلامی قوم میں وجود نہیں رکھتے۔ اسلامی پارلیمنٹ کو نہ تمدنی انقلابات سے سابقہ ہوگا نہ ملک کی ایسی نئی نئی ضرورتوں کے مطابق قانون بنانے میں وقت صرف کرنا پڑے گا جو یورپ کی قوموں میں تمدن کی ناپائداری اور تغیر پذیری کے باعث رونما ہوتی رہتی ہیں۔ غرض اسلامی ملک میں قوم کی نیابتی مجلس وضع قوانین کا اختیار رکھنے والی جماعت نہ ہوگی بلکہ اسے نظم و نسق پر نگرانی کا حق حاصل ہوگا اس کا مقصد صرف یہ ہوگا کہ قوم پر دیانت اور دانشمندی کے ساتھ حکومت کی جائے اور لوگوں کے ساتھ جہاں تک ممکن ہو، کامل انصاف اور حق رسی کا برتاؤ کیا جائے اور اس طرح قوم کے نشوونما پانے میں مدد اور تقویت پہنچائی جائے۔

وضع قوانین کا حق

چونکہ اسلامی قوم کے لئے قوانین وضع کرنے کا کام درحقیقت نہایت اہم تمدنی کام ہے اور مغربی اقوام کی طرح یہاں اس کام میں سیاسی اغراض کا عنصر غالب نہیں ہے، لہٰذا قانون سازی کا حق[1] اسی شخص کو ملنا واجب ہے جو قانون وضع کرنے جانتا ہو یعنی فقیہ ہو کیونکہ یہاں قلت و اکثریت کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ محض قابلیت کا سوال ہے، اگر محض قابلیت یا فن کی مہارت سے ایک طبیب کو یہ حق مسلمہ طور پر حاصل ہے کہ لوگوں کی صحت کی نگرانی اسی کے سپرد کی جائے تو ساری قوم کی اخلاقی اور تمدنی صحت کی نگرانی تو لامحالہ اس بات کی کہیں زیادہ مستحق ہے کہ اس کا حق صرف صاحب مہارت یا ایسے شخص کو تفویض کیا جائے جو اسکی خاص قابلیت رکھتا ہو۔

---

[1] یعنی شریعت کے اصولی اور ناقابل تغیر احکام کی روشنی میں فروعی اور جزئی ہنگامی اور وقتی مسائل کے متعلق قوانین (Bye Laws) مرتب و مدون کرنے کا فریضہ۔ "طلوع اسلام"

وضع قوانین کا حق صرف فقہا (Jurists) کو ملنا چاہیے۔ یعنی ماہرین کی اس جماعت کو جو علوم شریعت کی تحقیق و مطالعہ میں مصروف رہتی ہے مگر یہ بات لازمی ہے کہ ان فقہاء کا علم، عمل صالح اور تقویٰ سے آراستہ ہو تاکہ وہ لوگوں کے دلوں میں اپنی عزت و توقیر قائم کر سکیں اور جو قوانین بنائیں وہ قوم میں رتبہ قبول پائیں۔ بہرحال قوم کا کام ہوگا کہ اپنی پارلیمان کی طرح اپنی مجلس مقننہ . . . . . (Legislative Assembly) بھی ایسی انتخاب کرے جو آزاد اور بالکل بے لوث ہو اور پارلیمنٹ کی طرح اس کا مقصد بھی یہ ہو کہ شریعت کی حکومت قاہرہ کو قوت پہنچائے۔

اس تدبیر سے اسلامی تشریع (Legislation) کی عمارت اپنی تیرہ سو سال کے آثار قدیمہ پر قائم رہے گی جو عدل و دانش کی صفات سے متصف ہیں اور حیرت انگیز کامیابی سے زمانے کے سارے نشیب و فراز کا مقابلہ کر چکے ہیں۔ اس طرح اسلامی تمدن نہایت پائیدار منتظم اور ترقی پذیر رہے گا۔ اسلامی تہذیب و شعائر ناگہانی ردوبدل سے محفوظ ہو جائیں گے اور اپنی فطرت کے مناسب ایسے طریقوں سے نشوونما پائیں گے جن کی صحت، معقولیت اور باہمی مناسبت کو خوب سوچ بچار کر انہیں اختیار کیا گیا ہوگا۔

صدر حکومت

اسلامی مملکت میں حکومت کا ماخذ شریعت ہے۔ بلکہ حکومت محض شریعت کا لازمہ اور اس کی خادم و پاسبان ہے۔ لہٰذا جہاں تک ممکن ہو اسے قومی اور وسیع الاختیار ہونا چاہیے تاکہ شریعت سے جس قدر فوائد حاصل ہوتے ہیں وہ ان کی پوری طرح کفیل ہو حکومت کیسی ہی نیک نیت اور قوم کی بہی خواہ کیوں نہ ہو اگر قوت و اقتدار نہیں رکھتی تو زمین شور کی مثل ہے جس میں کوئی پھل نہیں۔ اسلامی ملک میں حکومت کے پاس لازمی طور پر تمام ایسے اخلاقی، مادی اور تمدنی وسائل مہیا ہونے چاہئیں جو اس کے خاطر خواہ اور دیرپا کام کرنے کے لئے درکار ہیں۔ حکومت کے قوی اور کارگر ہونے کی ایک شرط تو یہ ہے کہ اس کی باگ شخص واحد کے ہاتھ میں ہو اور دوسری اتنی ہی ضروری شرط یہ ہے کہ صاحب حکومت کو قوم منتخب کرے۔ یہ قوم کا قطعی طور پر مسلمہ حق ہے۔ قوم کا فرض ہے کہ ملک کے نظم و نسق کے ٹھیک ٹھیک کام کرنے کی نگرانی رکھے۔

حاکم اعلیٰ قوم کے انتخابات سے مقرر ہوگا اور اسے تمام وہ حقوق و اختیارات حاصل ہوں گے جو اس کے حکم کو کارگر بنانے کے لئے درکار ہیں۔ البتہ نیابت یا تفویض اختیارات کے ذریعہ سے وہ اپنے بعض فرائض دوسروں کے سپرد کرے گا اور انہیں وہ حقوق عطا کرے گا جس سے وہ لوگ حاکم اعلیٰ کے نائب بن کر نظم و نسق کی خدمت بخوبی انجام دے سکیں۔

چونکہ قوم کے اجتماع نے حاکم اعلیٰ کو وہ اختیارات تفویض کئے ہیں جن کا ماخذ شریعت ہے۔

لہٰذا وہ شریعت کے وکلاء اور محافظین دونوں کے سامنے اصالتاً جواب دہ ہے۔ اسلامی تنظیم کی طرف خصوصیت یہ ہے کہ اس حاکم کے نائب بھی بطور خود شریعت اور قوم کے مبعوثین کے سامنے جواب دہ ہیں۔ ملت اسلامی اپنے حاکم کو ایک دن میں دولت و اقبال کی بلند ترین چوٹی سے اتار کر معمولی انسانوں کی صف میں پہنچا سکتی ہے۔

حکومت عاملہ Executive Power

ہر قابلیت ایک حق عطا کرتی ہے اور ہر ایک حق کسی قابلیت کی دلیل ہوتا ہے یہی صورتیں ہیں جن کے بہم ہو جانے سے آزادیٔ عمل پیدا ہوتی ہے۔ اگر قومی نیابت کو حکومت پر نگرانی رکھنے کا حق ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ قوم ہی یہ فیصلہ کرنے کی قابلیت رکھتی ہے کہ حکومت عاملہ کا سلوک قوم کے ساتھ اچھا ہے یا برا؟ اسی طرح جماعت تشریع (یا مجلس وضع قوانین) کو قانون بنانے کا حق اس بنا پر حاصل ہوا ہے کہ وہ قانون سازی کی قابلیت رکھنے والے افراد پر مشتمل ہے۔ حکومت اور نظم و نسق کے فرائض انجام دینے کے واسطے جماعت عاملہ کو بھی ایک خاص قابلیت درکار ہے اور وہ انتظامی تجربہ ہے کہ اگر حکام پہلے سے یہ تجربہ نہیں رکھتے تھے تو اب حاصل کر رہے ہیں۔ اسی سے انھیں انتظامی کاروبار کے انجام دینے کا حق حاصل ہوتا ہے۔ پھر جس طرح حق اور قابلیت مل کر مجلس مبعوثین اور مجلس فقہا کو اپنے کام میں آزادی عطا کرتے ہیں اسی طرح حق اور قابلیت سے جماعت عاملہ کو عمل کی آزادی میسر آتی ہے اور انتظامی عمل کے میدان میں اسے کامل آزاد ہونا بھی چاہیئے جس طرح پارلیمنٹ اور مجلس فقہاء اپنے اپنے حلقے میں آزاد ہیں۔

حکومت عاملہ پر نگرانی رکھنے کا حق پارلیمنٹ کو حاصل ہے۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ جماعت عاملہ کی آزادی میں کوئی رکاوٹ پیدا ہو جائے جسے اپنی پسند اور ضمیر کے موافق عمل کرنا ناگزیر ہے ورنہ وہ کام کیا کرے گی اور جواب دہ کس بات کی ہوگی؟ پارلیمنٹ یا مجلس مبعوثین کا حق درحقیقت محض جانچنا اور تنقید کرنا ہے۔ وہ حکومت کو بھگاتی اور جگاتی ہے، اس پر حکم نہیں چلاتی۔ پھر ایسے موقع پر جبکہ مبعوثین اور عمال کا باہمی اختلاف زیادہ سنگین صورت اختیار کرلے تو حاکم اعلیٰ کا کام ہے کہ وہ مداخلت کرے اور قوم کے اعتراض کے مطابق جھگڑے کا فیصلہ کرے لیکن قوم کو مطمئن کرنے کی یہ شرط بھی حکومت عاملہ کی آزادی پر کوئی قید مالا یطاق عائد نہیں کرتی۔

سیاسی فرقے

ممالک مغرب کے سیاسی نظام میں سیاسی رقابتیں ہر جگہ آبادی کے مختلف طبقوں کی باہمی عداوت سے پیدا ہوتی ہیں کہ کہیں تو ایک طبقہ اسی نظام تمدن کو الٹ کر اپنی حسب منشا تمدن کا نیا نقشہ جمانا چاہتا ہے اور کہیں ایک فرقہ اس نظام میں اس طرح ردو بدل کرنا چاہتا ہے کہ خود اس کی اغراض زیادہ اچھی طرح پوری ہو سکیں اور کہیں بعض لوگ اسے جوں کا توں

بحال رکھنے کے خواستگار ہیں۔ لیکن مسلمانوں کے سیاسی نظام میں جو اختلافات ہوں گے وہ صرف ایک مشترک مقصد کو حاصل کرنے کے وسائل و ذرائع کے متعلق ہوں گے اور یہ واحد مقصد اسی نظام تمدن کو جو موجود ہے محکم اور مکمل کرنا ہوگا۔ پس مغربی نظام کے برخلاف جہاں سیاسی فرقے برابر موجودہ نظام تمدن کو بدلنے اور منسوخ کرنے کی دھن میں لگے رہتے ہیں، اسلامی ملک میں ان فرقوں کا کام تمدن کے انہی آئین کو محفوظ و برقرار رکھنا ہوگا جو اسلام نے اختراع کئے ہیں۔

مجلسِ اعیان (ایوانِ بالا) مجلس اعیان یا سینٹ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے امراء کی جمعیت ہے جو ایک خاص طبقے اور خاص خاص افراد کے منشا اور حقوق کے تحفظ کے لئے وجود میں آئی ہے اس کا کام یہ ہے کہ قوم کی عوامیت، یا جمہوریت کے رنگ میں رنگے جانے سے روک تھام کرتی رہے اور افراط و بے اعتدالی نہ ہونے دے۔ ایک اسلامی ملک میں اس جماعت کی تشکیل اور قیام کی کوئی ضرورت ہی نہیں رہتی جہاں افراد اور مختلف طبقات آبادی میں کسی قسم کی قانونی عدم مساوات کا وجود نہیں ہے۔ اسلامی ملک کو جس دانائی اور اعتدال کی اپنے ارتقاء میں ضرورت پڑے گی وہ ہمیشہ اس کا واحد شعبہ مجلس، جماعت فقہا کی مدد سے بخوبی بہم پہنچاتا رہے گا اور ان دونوں کی دلالت اور رہنمائی شریعت کرے گی۔

اس طرح ان محکموں کے ذریعہ سے جن کا میں نے اوپر خاکہ کھینچا یعنی جماعت نگراں یا مجلس مبعوثین۔ جماعت واضع قوانین اور جماعت عاملہ کے قیام سے اسلامی حکومت پوری طرح منشائے شریعت کے مطابق کام کرے گی۔ یہ جماعتیں اپنی اہلیت اور خاص خاص فرائض انجام دینے کی وجہ سے ایک دوسرے سے آزاد ہوں گی۔ اسی کے ساتھ جماعت عاملہ کو پورا اقتدار اور استعداد حاصل ہوگی اور وہ حکومت کے تمام شعبوں کو باہم اس طرح متحد رکھے گی کہ وہ شریعت حقہ کی دائمی اور کامل سیادت محفوظ رکھنے کے مقصد وحید میں سرگرم کار رہیں۔ اس طرح اسلام کی سیاسی زندگی میں بھی اسی امن و آشتی کا دور دورہ ہوگا جو امن و آشتی مسلمانوں کی تمدنی زندگی میں پائی جاتی ہے اور ہم اپنے تمدنی اور سیاسی آئین میں وہ کامل ہم آہنگی پیدا کرلیں گے جس کی اقوام کو حقیقی سود و بہبود کے لئے ضرورت ہے۔

اس مقالہ میں جیسا کہ ناظرین نے ملاحظہ کیا ہوگا، میرا مدعا صرف یہ بیان کرنا تھا کہ مسلمانوں کے نظامِ تمدن کے لئے جو سیاسی انتظام اور آئین حکومت سب سے موزوں اور پوری طرح مناسبِ حال ہے اس کی نوعیت اور منشا کیا ہونا چاہیے۔ میں نے صحیح معنی میں کسی سیاسی آئین سے بحث نہیں کی۔ قوم کا سیاسی آئین بنانا ماہرینِ فن کا کام ہے اور کسی خاص قوم کے واسطے آئین بناتے وقت اس کی سیاسی ضروریات کا انھیں لحاظ رکھنا ہوگا اور اس قوم کی اخلاقی اور دماغی حالت اور طبیعی خصوصیات کے

مطابق اپنے آئین کو ڈھالنا پڑے گا۔ مزید برآں آئینِ حکومت کی ایک ہی صورت کا تمام اسلامی قوموں کے لئے موزوں ہونا قیاس میں نہیں آسکتا اگرچہ ان قوموں میں مماثلت کے بے شمار پہلو موجود ہیں۔ اسی خیال سے اگر میں نے سیاسی آئین کے متعلق قیاس آرائی کی کوشش نہیں کی تو امید ہے کہ ناظرین کو اس پر تعجب نہ ہوا ہوگا۔ حقیقت میں میرا مطلب تو اپنے ہموطنوں اور عام برادران اسلام کو صرف اتنا جتانا ہے کہ اگر انھوں نے مغرب کے سیاسی آئین کی نقالی اختیار کی اور اسی کے ساتھ نوعِ انسانی کے اسی حصہ کے تمدنی اور سیاسی اصول کے پیرو ہو گئے تو یہ ایسی نقصان رساں غلطی ہوگی جس کی کوئی تلافی نہ ہو سکے گی۔ اغیار کا اسلامی دنیا پر قبضہ غیر معین مدت تک قائم رہے گا اور نہ معلوم کب تک مسلمان اجانب کی غلامی کی لعنت میں گرفتار رہیں گے۔ انھیں کبھی اپنے غیر قوم کے حکمرانوں کی برابری نصیب نہ ہو سکے گی اور اس کا انجام یہ ہوگا کہ ذلیل و خوار ہو کر وہ دائماً اقوامِ مغربی کے محکوم رہیں گے۔

اس میں کلام نہیں ہے کہ دورِ جدید کے مسلم اربابِ فکر کے لئے اصلاحِ امت کا یہ کام انجام دینا کچھ سہل نہیں ہے۔ لیکن وہ جس قدر دشوار ہے اسی قدر شاندار بھی ہے۔ بے شبہ اس میں بڑے استقلال ایثار، بے نفسی، ہمت و حوصلہ مندی اور سب سے بڑھ کر اسلام کی حقانیت اور فتح پر کامل ایمان رکھنے کی ضرورت ہے ایسا ایمان جس میں کبھی لغزش نہ ہو اور جو خلوص و جوش سے مملو ہو کہ ہمارے تعلیمی قویٰ کو قوت دے اور انھیں اپنے زورِ بازو پر وہ اعتماد عطا کرے، جو اس دشوار مہم کو سر کرنے کے لئے ناگزیر ہے اس اہلیت کے واسطے اعلیٰ درجے کے اخلاقی اوصاف درکار ہیں اور اگر یہ اہلیت نہیں تو مسلمان اربابِ فکر کا یہ دعویٰ بھی باطل ہوگا کہ انھیں زندہ رہنے کا حق حاصل ہے۔

بلند پایہ کتابیں خریدتے وقت

عارف پبلشنگ ہاؤس

راسن روڈ نزد جیک سینما بندر روڈ کراچی

کو ــــ یاد ــــ رکھئے

مقامی خریدار

دفتر

طلوعِ اسلام

میں آکر پرچہ خریدیں

ادارہ طلوع اسلام کے نقصان کی ایک اہم وجہ یہ بھی تھی کہ اس کا اپنا دفتر نہ تھا مقامی طور پر پرچہ کی نکاسی کے لیئے دوسرے کتب فروشوں کی محتاج تھی اور اس طرح ایک بڑی رقم کمیشن کی صورت میں ادا کرنی پڑتی تھی۔

اب

بفضل تعالیٰ طلوع اسلام کا اپنا دفتر قائم ہو گیا ہے۔

اگر آپ طلوع اسلام کی سعادت کی خاطر تھوڑی سی تکلیف گوارا فرما کر جاری دوکان عارف پبلشنگ ہاؤس نزد سینیما بندر روڈ پر تشریف لے آیا کریں تو ہم طلوع اسلام کے علاوہ آپ کے مذاق کی بلند پایہ کتب بھی پیش کر سکیں گے۔ آپکے اس تعاون سے طلوع اسلام آپ کی زیادہ سے زیادہ خدمات انجام دے سکے گا۔

مینیجر طلوع اسلام۔ رابسن روڈ۔ کراچی

صورت شمشیر ہے دست قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

تاریخ

افکار و سیاسیات

اسلامی

اسلام میں عجمی افکار و علوم کے اثرات و نتائج پر تنقید۔
یعنی اسلام کے نصب العین حکومت الٰہیہ کی تشریح۔
اسلام میں ملوکیت، قیصریت، پاپائیت و شیعیت کا نفوذ، ان کے آغاز، ارتقاء، انحطاط کی مفصل تاریخ
اسلام میں بیرونی علوم و افکار کا شیوع اور قرآن حدیث و فقہ و فلسفہ و کلام اور تصوف پر ان کے اثرات و نتائج و تحقیق و تنقید باہمی نزاعات پر مبنی سیاسیات، عقاید فقہ و فلسفہ کے اسباب و نتائج۔
تجدید احیائے دین کی مساعی اور زوال ملت اسلامیہ کی مکمل تاریخ عصر حاضر سے اسلام کا تصادم اور مستقبل کی تعمیر

از عبدالوحید خان بی اے ایل ایل بی

قیمت۔ فی جلد آٹھ روپے

ملنے کا پتہ

لاہور۔ تمام تاجران کتب سے

کراچی۔ عارف پبلشنگ ہاؤس۔ رابسن روڈ کراچی

اسبابِ زوالِ امت

مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی نے طلوع اسلام کے "ایک اہم سوال" کا جواب دو قسطوں میں اپنے اخبار "صدق" میں سپردِ قلم فرمایا ہے۔ ہمیں اس جواب کی صرف دوسری قسط موصول ہوئی ہے جسے درج ذیل کیا جاتا ہے۔

لمبے چوڑے سوال کا لب لباب صرف اس قدر ہے کہ مسلمان جو اپنے کو ایک مقبول اور محبوب امت سمجھتے ہیں، وہی آج ہر طرف سے زوال و بدا قبالی کی زد میں کیوں ہیں؟

جواب میں پہلا سوال تو یہ ہے کہ آیا انکو اپنی حیثیت سے کسی مصیبت میں مبتلا ہو جانا یا کسی ابتلاء کا پیش آجانا، مطلقاً دلیل عدم مقبولیت اور مردودیت کی ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو بیشمار مقبول بندے طرح طرح کی تکلیفوں میں کیوں مبتلا دیکھے جاتے؟ اور حدیث میں کیوں وارد ہوتا ہے۔ کہ سب سے زیادہ بلائیں انبیاء ہی کے لئے ہیں؟ ــــ تو جو قاعدہ افراد و اشخاص کے لئے ہے، وہی آخر قوموں اور امتوں کیلئے کیوں نہ ہو؟

امتِ اسلامی اور افرادِ امت، جیسا کہ اپنی جگہ بیسیوں دلائل سے ثابت ہے، دونوں خالق کائنات کی نگاہ میں محبوب ہیں، وہ انھیں اپنی بہترین نوازشوں اور رحمتوں سے سرفراز کرنا چاہتا ہے۔ لیکن دوسری طرف امت اور اکثر افرادِ امت کی بدکاریاں، نافرمانیاں، معصیت کوشیاں بھی کچھ کم نہیں ہیں جن کا طبعی مقتضا عذاب ہی ہے۔ حکمتِ الٰہی نے اس متضاد صورتِ حال کا حل یہ رکھا کہ گنہگاروں اور خطاکاروں کو سزا تو بہرحال دی جائے، لیکن سزا اپنی خفیف ترین اور سہل ترین صورت میں ہو۔ اور عذاب کی آسان ترین صورت وہی ہے، جو بجائے آخرت یا برزخ کے اسی عالم ناسوت میں ہو ــــــــ یہاں کی بیماریاں، ہلاکتیں نامرادیاں اور ذلتیں، پستیاں اور شکستیں، سب اسی عذاب دنیوی و ناسوتی کی شکلیں ہیں۔

حکم ایمان اور عمل صالح دونوں کا ہے۔ عمل صالح میں جتنی کوتاہیاں رہیں، ان کے لحاظ سے امت کو عذاب تو بہرحال بھگتنا ہے لیکن تصدیق ایمان کی بھی رعایت اس حد تک ہے کہ وہ سزا بجائے بیداری کے خواب میں رکھ دی گئی اور بجائے آخرت کے عذاب ابدی و غیر منقطع کے یہیں کے چند روزہ دکھ درد میں مبتلا کر دیا گیا ــــــــ غیروں کے ساتھ چونکہ کوئی اس قسم کی رعایت مقصود نہیں، ان کی سزائیں پوری کی پوری اسی عالم کے لئے اٹھا رکھی گئیں۔ اور یہیں سے یہ دھوکا بہتوں کو لگ جاتا ہے کہ منکروں کو تو عیش میں دیکھا جا رہا ہے

اور بلاؤں کے ہدف صرف اپنے ہی بن رہے ہیں!

عین شانِ رحمت و صنعتِ حکمت کے اقتضا سے یہی ہونا ہی چاہئے تھا۔

محمد حسین صاحب عرشی، دار القرآن، لاہور

انفرادی امراض کے اسباب کی تشخیص و تعیین مشکل ہی، لیکن جماعتی اور وہ بھی بالخصوص مسلمانانِ عالم کے جماعتی مرض کی تشخیص کسی اور کے نزدیک مشکل ہو تو ہو، میرے نزدیک تو ایسی واضح اور بین ہے جیسے دو اور دو چار ـــــ میں جو اسبابِ مرض بتاؤں اور پھر اس کا جو علاج عرض کروں، ہمارے قومی معالج (اگر کوئی ہو) اس پر اعتماد کر کے اور پھر عمل کر کے دیکھ لیں، اگر کوئی بات غلط نکلے اور میرے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق ان کی محنت کا ایک لمحہ بھی ضائع ہو، تو میں یہ تحریر دنیا کے سامنے اپنے دستخط سے شائع کر رہا ہوں کہ

میری بوٹی بوٹی کر دی جائے۔ مجھے مجمع عام میں پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا جائے۔ دنیا بھر کے سزائی قوانین میں جو سخت سے سخت سزا ہے مجھے اس کا مستوجب قرار دیا جائے۔ (محمد حسین عرشی)

میں اپنی صداقت کے متعلق یقین دلانے کا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں پاتا ـــــ اب آپ ذرا تفصیل سے سنئے کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں ـــــ میں، آپ اور تمام دنیا کے مسلمان (سمجھیں یا نہ سمجھیں) مل کر ایک جسم ہیں ہمارا مرض عالمی مرض ہے۔ ہم مسلمان کہلانے والے دنیا کے ہر گوشے میں ادبار و تسفّل کے گڑھے میں گرتے جا رہے ہیں، جہاں ہم محکوم ہیں وہاں ہی ذلت ہمارے لئے کافی ہے اور جہاں آزاد کہلاتے ہیں، سچ پوچھئے تو وہاں بھی ہمارے محکوم ہم سے اچھے ہیں۔ ہم ہر لحاظ سے آزادی کے غیر مستحق اور نااہل ثابت ہو رہے ہیں۔ ہماری جمعیت بے شمار قسم کے سیاسی اور مذہبی گروہوں میں بٹ چکی ہے۔ اگر ہمارے سامنے دین و دنیا کے کروڑ مسئلے درپیش ہیں تو ان میں ایک بھی ایسا نہیں جس پر ہماری تمام جماعتیں متفق ہوں۔ اور تو اور ہمارا سب سے بنیادی اور واحد مسئلہ، مسئلۂ توحید ہے۔ اسلامی توحید جس کے علو و عظمت کا غیر مذاہب کے اعاظم رجال بلکہ دہریوں تک کو بھی اعتراف کرنا پڑا۔ حد یہ ہے کہ ہمارے اندر اس کا بھی کوئی متفقہ تصور نہیں رہا۔ ہر پارٹی کی توحید دوسری تمام پارٹیوں سے الگ ـــــ ایک کی توحید کا دوسرے کی توحید سے اتنا ہی فرق ہے جتنا توحید اور شرک میں۔[1]

ہمارا ایک بہت پرانا اور بہت بڑا فرقہ یہ کہتا ہے کہ صحابۂ نبی صلعم سے اعلانِ برأت کئے اور حضرت حسینؓ ابن علیؓ کے دامن میں پناہ لئے بغیر مسلمانانِ عالم کی دنیوی فلاح اور دینی نجات ناممکن ہے۔ دوسرا تاریخی اور عالمگیر گروہ اس کو عین ضلالت کہہ کر امام ابو حنیفہؒ اور ان کے محترم شاگردوں کی

---

[1] یاد رہے کہ وجدی فرقے کے لوگ شہودیوں کو مشرک کہتے ہیں اور ہماری اکثریت انہی دو میں منقسم ہے۔

تجویز کردہ راہ پر چلنے میں سعادت دارین تصور کرتا ہے۔

تیسرا ترقی پسند جتھا صحاح ستہ کے مؤلفین کی تحقیقات پر ایمان لائے بغیر اسلام بلکہ قرآن ہی کو ادھورا سمجھتا ہے۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔ (حالانکہ ان تینوں نے اپنے آزاد دائرہ عمل (ایران، ترکی، نجد وغیرہ) میں کوئی شان وسطوت حاصل نہیں کی)

سب فرقوں کا احاطہ کرنا ناممکن ہے۔ ہر صدی اس قسم کے بے شمار الگ الگ "نجات فروشوں" سے بھری پڑی ہے۔ یہاں تک کہ آج کی قادیانی جماعت اور اسلامی جماعت وغیرہ بھی یہی دعویٰ لے کر اٹھی ہیں کہ جو کچھ ان کے مقتداؤں نے کہہ دیا ساری دنیا کا اس کے آگے سر جھکا دینا ہی فوز و فلاح کا ضامن ہو سکتا ہے۔

اب بتائیے یہ بے شمار متضاد نظریئے اور متخالف رائیں دوزخ کی سرحد سے ادھر کسی بات پر متفق ہو سکتی ہیں؟ ——— نتیجہ یہ نکلا کہ ارادی اور غیر ارادی طور پر قوم کا دین ہی سے اعتماد اٹھ گیا۔ عملی اور ذہنی بغاوت تو عام ہے ہی، کھلی بغاوتوں نے بھی جنم لینا شروع کر دیا۔ اور یہ جو کچھ ہوا اور ہو رہا ہے ہونا ہی چاہیئے تھا ——— لاش، معشوق کی لاش ہی کیوں نہ ہو کب تک عاشق اس کو گلے سے لگائے رکھے گا۔ آخر اس کی سڑاند سے بیزار ہو کر اس سے الگ ہو جائے گا، یا خود بھی اس کے ساتھ لاش بن کر رہے گا ——— مسلمانوں کی اس وقت دین سے بیزاری یا "دیندار" بن کر مردوں کی سی زندگی یہی معنی رکھتی ہے۔

بدھ گوتم ہندوستان کا سب سے بڑا بت شکن تھا۔ اس کی تحریک نے برہمنیت کے شجرۂ خبیثہ کو جڑ سے اکھیڑ دیا۔ مظلوم و محروم برہمنوں نے جب دیکھا کہ اس کا مقابلہ میدان میں نہیں ہو سکتا تو دوسرا مخفی طریقہ اختیار کیا ——— بدھ ازم کے حلقہ بگوش بن گئے وہی چیز جو مقابلے میں کھڑے ہو کر بدھوں سے نہیں منوائی جا سکتی تھی، خود بدھی بن کر اس پر عمل شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں ہر گھر بدھ مورتی کا مندر بن گیا۔ اب سناتن دھرم اور بدھ مت میں اس کے سوا کوئی فرق نہ رہا کہ دونوں گروہوں کے بت الگ الگ تھے، لیکن بنیادی طور پر تھے دونوں ہی بت پرست۔ مختلف اماموں کے ماننے والے تو آپس میں لڑتے جھگڑتے ہیں، لیکن مختلف بتوں کے پجاری رواداری سے مل بیٹھتے ہیں۔ اس ترکیب سے برہمنوں نے قوت حاصل کر کے بدھ مت سے وہ انتقام لیا کہ اس کی مسخ شدہ شکل کو بھی اپنی "پوتر بھومی" پر گوارا نہ کر سکے۔

تلک الایام نداولھا بین الناس ——— یہی نسخہ مخالفین اسلام نے استعمال کیا۔ جب تک مسلمان کمزور تھے، کھلے بندوں ان کو مٹانے کی ترکیبیں اختیار کی گئیں، لیکن جب پھونکوں سے نور الٰہی کا چراغ نہ بجھ سکا اور امت مسلمہ قوی سے قوی تر ہوتی گئی ——— تو انھوں نے بھی اسلام کا چولا اوڑھا۔ قرآن میں ردوبدل تو محال تھا ——— قرآن سے باہر ایک ایسے دین کی ترویج شروع کر دی جس کو مٹانے کے لئے

حضرت محمد مصطفیٰؐ اور تمام انبیاء (علیہم السلام) مبعوث ہوئے تھے۔ معاف فرمایئے اگر میں یہ کہہ دوں کہ اگر رسول اللہ صلعم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اس وقت دنیا میں تشریف لے آئیں اور ہم نے گذشتہ پونے چودہ سو سال میں جو دین کے متضاد و متخالف انبار تیار رکھے ہیں آپ کے سامنے رکھ دیں تو آپ یقیناً اس سے قطعی ناواقفیت بلکہ بیزاری کا اظہار کریں گے۔ ادھر ہمارے فرقے اپنے اپنے "دین" میں اتنے پکے ہیں کہ جب وہ ان ابتدائی مسلمانوں کو دیکھیں گے کہ نہ تعزیئے کی تائید کرتے ہیں، نہ عرس و قوالی سے رغبت رکھتے ہیں، نہ صوفیہ کرام کی اصطلاحات سے واقف ہیں، نہ محدثین کے رجال، جرح و تنقید اور تطبیق حدیث کے فن میں مہارت رکھتے ہیں (وغیرہ وغیرہ) تو ان بزرگوں کی دینداری سے متعلق تحیر و تذبذب میں ڈوب جائیں گے ــــ ان بیچاروں نے اپنے پیغمبر صلعم کی زبان سے سن رکھا تھا۔

الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی ۔

آج کے دن میں (خدا) نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی۔

وتمت کلمت ربک صدقا وعدلا

اور تیرے رب کی بات سچائی اور انصاف کے مطابق کمال کو پہنچ گئی۔

لیکن ہم نے تو خدائی تکمیل و اتمام اور ربانی صدق و عدل پر اعتماد نہ کیا اور لگے اپنی طرف سے بے شمار اضافے کرنے۔ یوں سمجھئے، چولھے پر ہنڈیا چڑھی ہے، اس میں پورے اندازے سے تمام مسالے ڈال دیئے گئے ہیں۔ اب گھر کے بچے، بوڑھے، جوان، مرد، عورت، مہمان وغیرہ جو بھی آتا ہے اس میں نمک، مرچ پیاز، لہسن، دھنیے وغیرہ کا اضافہ کرتا جاتا ہے۔ خدا را کوئی شخص جس کے دماغ میں تھوڑی سی عقل ہے، مجھے بتائے کہ وہ سالن کیا ہوگا۔ کھانے والے اس سے کیا حظ حاصل کریں گے۔ کیا بعینہ یہی حشر ہمارے دین کا آج تک نہیں ہو رہا۔

ہر کہ آمد عمارتے نو ساخت   رفت و قصہ بدیگرے پرداخت

مسلمان صرف صورتاً ہی قبر پرست نہیں ہے معناً بھی لاش پرست بن چکا ہے۔ زندہ خدا کی زندہ کتاب کو چھوڑ کر مرنے والے انسانوں کی ذہنی تصنیفوں کو جو اپنا وقت پورا کر کے مر چکی ہیں، چھاتی سے لگائے ہوئے سبقت پسند دنیا میں آگے بڑھنے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ آج اگر ہم کوئی اسلامی قانون بنانا چاہیں تو اس میں ہرگز کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ ہمارے سامنے سینکڑوں، ہزاروں "اسلام" ہیں۔ وہ کونسا قانون ہوگا جو ان تمام مختلف و متضاد "اسلاموں" کے مطابق ہوگا اور ان کے باہم جنگ جو پیروؤں کو مطمئن کر سکے گا۔

دق و سل کا مریض ممکن ہے کہ شفا پا جائے۔ یہ بھی محال نہیں کہ جذامی کا بدن کسی طریق علاج سے کندن کی طرح نکھر جائے ــــ لیکن ہماری قوم کے افراد جو "اُشْرِبُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ" کے مصداق اپنے اپنے

ہزاروں بچھڑوں کے عشق میں سرشار ہوکر جھوم رہے ہیں، ناممکن ہے کہ اپنے سینوں سے ان کو باہر نکال کر خدائے واحد کو جگہ دے سکیں۔ ایک مریدکے لئے یہ تو ممکن ہے کہ وہ عملاً، قولاً یا ذہنی طور پر خدا، رسولؐ اور قرآن کا انکار کردے، لیکن اپنے پیر کا انکار کردینا اس کے بس کی بات نہیں۔

بھیکھا وہ نر کوڑھ ہے جو گر کو جانے اور ہر روٹھے گر میل دے گر روٹھے نہیں ٹھور

یعنی خدا روٹھ جائے تو پروا نہیں، پیر صاحب صلح کرادیں گے اور کہیں پیر صاحب روٹھ گئے تو پھر کہیں ٹھکانا نہیں۔ یہ ہے وہ حقیقت جس کو ہم شب و روز اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ اس لئے یہ امید رکھنا کہ ہم سب یا ری اکثریت کبھی کسی ایک بات پر متفق ہوسکے گی، عنقا کو شکار کرنے کے مترادف ہے۔ اور

اینجا ہمیشہ باد بدست است دام را

اتحاد کی اپیل کسی وعظ، تصنیف یا قانون کے ڈنڈے سے کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی۔ ہم مسلمان جس عزیز مرض اور لذیذ موت کو صحت و حیات سمجھ چکے ہیں، ایسا ہی سمجھتے رہیں گے اور جو شخص ہم کو حقیقی صحت یا زندگی کی طرف دعوت دے گا ہم اس کے دشمن ہوجائیں گے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب لاعلاج صورت پیدا ہوچکی ہے تو کیا مایوس ہوجانا چاہئے؟ — نہیں — ہمیں مایوس ہونے کی اجازت نہیں۔

کروڑوں میں سے چند آدمی ضرور ایسے نکل آئیں گے جو متذکرہ حقائق سے واقف اور متفق ہوں گے۔ وہ کسی جگہ اکٹھے ہوجائیں اور کسی ترکیب سے اپنی متفقہ تجاویز سے حکومت کے صحیح اقبال جلنے کو متاثر کریں مشکلات کا احساس دلائیں، پھر قرآنی حل بتائیں اور آئندہ نسلوں کی صحیح تعمیر کے لئے نصاب تعلیم صرف اساسی اور متفقہ امور پر منحصر رکھنے کی تحریک کریں۔ اہل اختلاف کو اختلاف سے چمٹے رہنے دیں۔ جو شخص سارا ہی ناسور بن چکا ہو، اس کے ناسور کا علاج شخص کا خاتمہ ہے، جس کے لئے وہ کبھی تیار نہ ہوگا۔ اس کے لئے وقت اور قدرت کی کارسازی کا انتظار کریں۔ آئندہ نسل کی فکر کریں، اس کیلئے تعلیم قرآن کو لازمی کردیں، معلمین قرآن کی تلاش میں احتیاط لازم ہے۔ تعلیم قرآن کے بعد ہر شخص کو آزاد چھوڑ دیا جائے کہ وہ اپنے لئے کوئی فرقہ تجویز کرے یا خالص مسلمان ہوکر رہے۔ مجھے یقین ہے کہ جو بچے خارجی اثرات سے خالی الذہن رہ کر صحابہؓ کی طرح پہلے پہل قرآن حکیم سے متعارف ہوں گے وہ فرقہ پرستی پر مسلمانی ہی کو ترجیح دیں گے۔ یہ کام معجزے سے نہیں، مسلسل محنت و اخلاص اور انتھک سعی و جہد سے ہوگا۔ فرقہ پرست ماحول اس اقدام کے لئے سخت رکاوٹ بنے گا، لیکن تدبر اور تحمل سے بتدریج اس مقصد اعلیٰ کی طرف قدم بڑھتا جائے گا۔ ہم اپنے قدماء کی مخلصانہ کوششوں سے بھی روشن ضمیری کے ساتھ فائدہ اٹھائیں گے، لیکن ان کے اختلاف آراء سے عوام کو لڑانے کا کام لینے کی اجازت نہیں دیں گے۔

پاکستان مسلم لیگ کی سیاست

"تنظیم نو" کے بعد

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند!

غیر منقسم ہندوستان کی مسلم لیگ نے ۱۹۴۰ء میں قرارداد لاہور منظور کی جو بعد میں قرارداد پاکستان کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس قرارداد میں برصغیر ہند کی سیاسی و آئینی مشکلات کا واحد حل "تقسیم" تجویز ہوا۔ ۱۹۴۳ء میں مدراس کے مقام پر آل انڈیا مسلم لیگ نے اپنا سابق موقف بدل کر حصول پاکستان مبنی بر قرارداد لاہور قرار دیا۔ ۱۹۴۶ء میں جب قرارداد پاکستان منظور ہوئی ہے تو اسے زیادہ سے زیادہ ایک مرحوم شاعر کی اس صدا کی بازگشت سمجھا گیا جو الہ آباد میں ۱۹۳۰ء میں سنی گئی تھی اور جسے شاعرانہ خوش خیالی سے زیادہ وقیع نہ سمجھا گیا تھا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ ایک "شاعر" کا یہ خواب بیسویں صدی کی زندہ حقیقت بن جائیگا اور اس قدر قلیل عرصہ میں کہ اغیار انگشت بدنداں رہ جائیں گے اور خود اپنوں کو اس تبدیلی کا یقین نہیں آئے گا۔ قائداعظم کے خلوص اور تدبر نے اقبال کے خواب کو درخشندہ حقیقت بنا دیا۔ مسلم لیگ اپنے موقف کو حاصل کرنے میں بالآخر کامیاب ہوگئی اور ۱۹۴۷ء میں پاکستان نے اقوام عالم کی صف میں آزاد ملت کا جداگانہ مقام حاصل کر لیا۔

"اغراض و مقاصد" پاکستان کی صورت میں موقف کے حاصل ہو جانے کے بعد مسلم لیگ کے لئے دو راہیں کھلی تھیں۔ ایک تو یہ آبرومندانہ اور ایثار پیشانہ راہ تھی کہ مسلم لیگ پاکستان کا تحفہ ملت کے سپرد کر دے اور اپنی انفرادیت ختم کر کے ملت میں جذب ہو جائے اور خود ملت بن جائے۔ دوسری راہ تحفظ ذات (Self-Preservation) کے طبعی محرک کا ایک حد تک غیر شعوری تقاضا تھا یعنی اپنے آپ کو ختم کر دینے کی قربانی نہ کر سکنے کی صورت میں مسلم لیگ بدلے ہوئے حالات سے مطابقت کرے اور جس پاکستان کو اس نے حاصل کیا ہے اسے ایک طے شدہ نظام کے مطابق مضبوط و مستحکم بنائے۔ یہ راہ اہلیت کی سرفروشی اور ایثار پیشگی سے محروم ضرور ہے لیکن ایک حد تک قابل فہم ہے۔ مسلم لیگ نے یہی دوسری راہ اختیار کی۔

عہد حاضر کی ایک سیاسی پارٹی سے کچھ اس قسم کی توقع ہی کی جاسکتی تھی۔ بہرکیف آل انڈیا مسلم لیگ پاکستان اور ہندوستان کی لیگوں میں منقسم ہوگئی۔ پاکستان مسلم لیگ نے مندرجہ ذیل مقاصد اپنے "دستور وضوابط" میں رکھے،

۱) پاکستان کی وحدت واستقلال کا تحفظ۔

۲) مسلمانانِ پاکستان کے مذہبی، ثقافتی، تعلیمی، معاشرتی، معاشیاتی اور سیاسی مفاد کی نگہداشت۔

۳) پاکستان کے مختلف حصوں کے مسلمانوں کے درمیان رشتۂ اخوت کا استحکام، باشندگانِ پاکستان کے درمیان خوشگوار تعلقات کی ترقی اور پاکستان کی اقلیتوں کے جائز حقوق و مفاد کا تحفظ۔

۴) تمام عالم میں مسلمانوں کے مفاد کی ترقی اور پاکستان اور دیگر مسلم حکومتوں کے مابین برادرانہ روابط کا استحکام۔

۵) مقاصد مذکورہ کو فروغ دینے کیلئے ضروری اور مناسب اقدامات۔

ان اغراض ومقاصد پر طائرانہ نگاہ ڈالتے ہی اندازہ ہوجاتا ہے کہ ایک اسلامی یا مسلم حکومت کے ہوتے ہوئے ان مقاصد کو فروغ دینے کے لئے مسلم لیگ یا کسی بھی سیاسی جماعت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ طلوع اسلام کی گذشتہ اشاعتوں میں حکومت کے مقام وفرائض پر روشنی ڈالی جاتی رہی ہے۔ اگر حکومت ملت کا مرکزی ادارہ یا بالفاظ صحیح تر مرکز ملت ہے تو مقام تعجب ہے کہ مقاصد بالا (جو صریحاً فرائض حکومت میں شامل ہیں) کی آڑ لیکر مسلم لیگ حکومت کے اختیارات میں مداخلت کر رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دوعملی نظام سیاست وحکومت میں ناقابلِ عمل وناقابلِ برداشت ہے۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ اپنی ہستی کے جواز کے لئے ایسے ہی مہم، بلند بانگ اور بے معنی دعاوی کی ضرورت ہے۔ مثلاً پہلے مقصد کو لیجئے، یعنی پاکستان کی وحدت واستقلال کا تحفظ۔ کیا یہ صریحاً فریضۂ حکومت نہیں؟ اگر حکومت اس بنیادی فریضہ کی بجاآوری میں کوتاہی کرتی ہے یا بالکل قاصر رہتی ہے تو وہ ٹھکرائے اور معزول کردیئے جانے کے قابل ہے۔ یا کیا پاکستان کا کوئی باشندہ بھی ایسا ہوسکتا ہے جو پاکستان کی وحدت اور استقلال کا خواہاں اور محافظ نہ ہو؟ اگر ایسا ایک بھی "پاکستانی" ہے تو وہ گردن زدنی ہے۔ تو جب حکومت اور ساری قوم پاکستان کی محافظ ہے، پھر مسلم لیگ کس مرض کی دوا ہوگی؟ کیا وہ حکومت اور ملت میں یہ شعور پیدا کریگی کہ وہ جس ملک (پاکستان) کے باشندے ہیں اس کا تحفظ ان پر فرض ہے؟ کیا شعورِ قومی کا اجارہ مسلم لیگ کو حاصل ہوگا اور وہ اس کی "تقسیم" اور "رسد" کی ذمہ دار ہوگی؟ اسی پر قیاس اغراض ومقاصد کا قیاس کیا جاسکتا ہے۔ حقیقت خود بخود روشن ہوجائے گی۔ کیا یہ سیاسی شعبدہ بازی نہیں؟

بہرکیف ان اغراض ومقاصد کے سبز باغ تیار کرکے مسلم لیگ نے اپنی تنظیم نو کی۔ نئے سرے سے ارکان کی

بھرتی، عہدیداروں کا انتخاب وغیرہ۔ تنظیم جدید کن خطوط پر ہوئی اور اس سے کیا رجحانات ہویدا ہوئے تھے؟ اس پر مئی ۱۹۶۸ء کی اشاعت میں تبصرہ کیا جا چکا ہے۔ اب جبکہ مسلم لیگ از سرِ نو منظم ہو کر میدانِ سیاست میں کارفرما ہو چکی ہے، اس نے جو عملی نمونہ پیش کیا ہے، اس کی روشنی میں اس کی سیاست کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

کراچی کراچی پاکستان کا مرکز ہے۔ حکومت کا بھی مرکز ہے اور پاکستان مسلم لیگ کا بھی۔ اس مرکز میں کراچی کی نو منظم و مرتب مسلم لیگ عہدِ طفولیت میں ہی معطل ہو چکی ہے۔ اس کے ایک اجلاس میں دو مخالف (مسلم لیگی) پارٹیوں نے "مسلمانوں کے درمیان رشتۂ اخوت کا استحکام" (مقصد سوئم) کو فروغ دینے کے لئے (وہ) اور مناسب اقدامات" کئے کہ پناہ بخدا۔ جلسہ گاہ میں عام ہڑبونگ مچ گئی اور خوب دھینگا مشتی ہوئی۔ ایک پارٹی نے مسلم لیگ کے دفتر کا تالا توڑ لیا اور قبضہ کر لیا۔ دوسری پارٹی نے پولیس سے استمداد کی۔ اس ذلت آفریں اور شرمناک ہنگامہ پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔ اس ڈرامے کے کردار کس حد تک سنجیدہ اور ثقہ حضرات تھے اس کا اندازہ صرف ایک نمونہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ جسمانی ہنگامہ فرو ہونے پر پوسٹر بازی کی نوبت آئی اور کراچی کے در و دیوار نے مسلم لیگ کے تسلسل کی گواہی دی۔ تالا توڑنے والی پارٹی کے خلاف ایک قرارداد دوسری پارٹی نے منظور کی اور اس میں یہ مطالبہ کیا گیا کہ اس پارٹی کے خلاف یہ کارروائی کی جائے کہ ان لوگوں کو پانچ سال کے لئے مسلم لیگ سے نکال دیا جائے۔ یہ اشتہار عام طور پر در و دیوار پر چسپاں کیا گیا اور اس کا عنوان تھا، "تالا توڑنے پر پانچ سال کی سزا"۔ جب کسی بدبخت قوم کی سیاست، ثقاہت اور سنجیدگی سے اس حد تک عاری ہو جائے تو اہلِ نظر اس کے انجام کا بآسانی تصور کر سکتے ہیں۔ کراچی کی شہری لیگ ان دنوں معطل ہے اور اس کی تنظیمِ نو کے انتظامات ہو رہے ہیں۔ اب تیسری "جون" میں مسلم لیگ کس روپ میں ظاہر ہو گی اس کا لطیف اشارہ قاضی عیسیٰ[1] کے ذاتی نام سے منسوب مشہور محاورہ سے شاید مل سکے!

سندھ کراچی کے بعد سندھ کی باری آتی ہے۔ یہاں کے وزیرِ اعظم مسٹر کھوڑو کو گذشتہ سال متعدد الزامات میں برطرف کر دیا گیا۔ ان کے خلاف خاص عدالت نے تحقیقات شروع کی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسٹر کھوڑو کو تین سال تک "پبلک لائف" سے محروم کر دیا گیا۔ ایک اور مقدمہ میں تصرف بیجا اور مال مسروقہ اپنے قبضہ میں رکھنے کی بنا پر آپ کو دو سال قید اور ایک ہزار روپیہ جرمانہ کی سزا دی گئی۔ آپ کے بعد پیر الٰہی بخش سندھ اسمبلی مسلم لیگ پارٹی کے لیڈر منتخب ہوئے اور وزیرِ اعظم مقرر ہوئے۔ ان کے حاشیہ برداروں نے یہاں تک پروپیگنڈہ کیا کہ آپ وضو کر کے خدا کے حضور رو رو کر یہ عہد کرتے دیکھے اور سنے گئے کہ وہ ملک و ملت کی خدمت کر سکیں۔ انھوں نے اپنے عہدِ حکومت میں اس "جانفشانی" سے ملک و ملت کی خدمت سرانجام دی

---

[1] کراچی مسلم لیگ تیسری مرتبہ قاضی عیسیٰ صاحب کی نگرانی میں منظم ہو رہی ہے! آپ بلوچستان کے "چیف ایڈوائزر" کے سرکاری عہدہ پر فائز ہونے کے باوصف اس جماعتی فریضہ کی سرانجام دہی میں معروف ہیں۔

کہ مذکورہ افسانہ تراشنے یا ڈرامہ ترتیب دینے والوں نے خود ہی تلملا کر ان کے خلاف محاذ قائم کر لیا اور عوامیت سے ان کی برطرفی کا مطالبہ کیا جانے لگا۔ بارے سابقہ انتخابات کے سلسلہ میں ایک حریف کی غنڈہ داری آڑے آئی اور عدالت نے پیر الٰہی بخش کو چھ سال تک کے لئے ووٹری کے حق سے محروم کر دیا۔ اس سزا سے آپ خود بخود وزارت سے بے دخل ہو گئے۔

کھوڑو اور الٰہی بخش دونوں مسلم لیگ کے نمائندے تھے اور دونوں کے کارنامے اظہر من الشمس ہیں۔ پاکستان مسلم لیگ کے حوالہ بالا اغراض و مقاصد پھر پیش نظر لائیے اور ملاحظہ فرمائیے کہ سندھ میں مسلم لیگی وزارتوں نے پاکستان کو کس حد تک استحکام بخشا۔ صوبائی مسلم لیگ اور وزارت کے تعلقات باہمی طرفہ دلچسپی اور تفریح کا پہلو لئے ہوئے تھے۔ کھوڑو کی برطرفی کے بعد اور پیر الٰہی بخش کی وزارت عظمیٰ کے دوران میں صوبائی مسلم لیگ کے انتخابات کا معرکہ پیش ہوا۔ چودھری خلیق الزماں ناظم پاکستان مسلم لیگ نے مسٹر کھوڑو کو مجبور کیا کہ وہ صدارت کے لئے نہ کھڑے ہوں۔ مسٹر کھوڑو رضامند ہو گئے۔ خود چودھری صاحب کے اعتراف کے مطابق سندھ کا برطرف وزیر اعظم صوبائی مسلم لیگ کو اپنے قبضہ میں لانا چاہتا تھا۔ اس کے برعکس اس وقت کا وزیر اعظم پیر الٰہی بخش صوبائی لیگ کو اپنی "مخلوق" بنانے کا متمنی تھا۔ چودھری خلیق الزماں صاحب نے مسٹر کھوڑو کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ صدارت کے لئے جدوجہد نہ کریں لیکن پیر الٰہی بخش کے لئے راستہ صاف تھا۔ اسی ادھیڑ بن میں کاغذات نامزدگی داخل کرنے کی میعاد ختم ہونے لگی تو اس میں "پراسرار طور پر سات گھنٹے" کا اضافہ کر دیا گیا۔ مسٹر کھوڑو نے "اچانک" اور "غیر متوقع" طور پر اپنے کاغذات داخل کر دیئے۔ جب ہنگامہ فرو ہوا تو کھوڑو بھاری اکثریت سے صدر منتخب ہو چکے تھے اور پیر صاحب اپنے مساعی میں ناکام ہو چکے تھے۔ مسٹر کھوڑو نے اس غیر متوقع اقدام کے جواز میں بتایا کہ چونکہ وزارتی پارٹی مسلم لیگ پر قبضہ جمانا چاہتی تھی اس لئے میں نے اسے شکست دینے کے لئے اپنے کاغذات داخل کر دیئے۔ صدر منتخب ہو جانے پر آپ نے مجلس عاملہ اور دیگر متعلقہ مجالس کی تقرریاں حسب منشا کیں اور یہ کچھ کر چکنے کے بعد صدارت سے استعفا دیدیا۔ اس طرح وزارت اور مسلم لیگ دو حریف جماعتوں کی حیثیت اختیار کر گئیں اور ان میں معاونت کا سوال خارج از بحث ہو گیا۔ چودھری خلیق الزماں صاحب نے، جو اس وقت پاکستان مسلم لیگ کے ناظم تھے اور بعد میں صدر منتخب ہوئے، اس قضیہ میں عجیب پارٹ ادا کیا۔ انہوں نے ایک طرف کھوڑو کو صدارت حاصل کرنے سے روکا، لیکن وہ وزارتی پارٹی کو یہ مشورہ نہ دے سکے کہ وہ صوبائی لیگ پر قبضہ نہ جمائے، بلکہ اسے ایک آزاد جماعت کی حیثیت سے تشکیل ہونے دے تاکہ وہ صحیح معنوں میں وزارت کی نگراں اور محاسب ثابت ہو سکے۔

اس مجلس عاملہ نے جنوری ۱۹۵۸ء میں ایک قرارداد میں سندھ اسمبلی مسلم لیگ پارٹی سے مطالبہ کیا کہ وہ پیر وزارت کی تائید سے دست کش ہو جائے کیونکہ روز افزوں "سیہ کاری، بدنظمی، اقربا پروری، خویش نوازی" سے

وزارت نے عوام کا اعتماد ضائع کر دیا ہے۔ نیز حالات اس قدر ناگفتہ بہ ہو گئے ہیں کہ اگر مسلم لیگ وزارت سے بدستور متعلق رہی تو وہ بھی عوام کا اعتماد کھو بیٹھے گی، چنانچہ عاملہ نے پیر الٰہی بخش کے خلاف ضابطہ کی کاروائی کرنے کا فیصلہ کیا اور پیر صاحب سے ۱۵ دن کے اندر اندر جواب طلب کیا۔ ۲۱ رجنوری کو یہ قرارداد منظور ہوئی اور یکم فروری کو اخبارات میں شائع ہو گئی۔ ۲ رفروری کو پیر الٰہی بخش نے اخبارات میں بیان شائع کرایا جس میں انھوں نے کھوڑو کی مرتب مجلس عاملہ کو تسلیم کرنے سے ہی انکار کر دیا۔ گویا جیسا کہ انھوں نے ناکام کوشش کی اگر مجلس عاملہ ان کی مرضی کے مطابق مرتب ہوتی اور آپ کے اشاروں پر رقص کرتی تو آپ اسے تسلیم کر لیتے۔ جو مجلس صحیح یا غلط آپ کے اعمال پر تنقید و محاسبہ کرتی ہے اسے آپ تسلیم نہیں کر سکتے۔ اس بیان میں آپ نے لیگ کو مطعون کیا کہ وہ سیاست میں کٹھ پتلی کی طرح استعمال ہو رہی ہے اور یہ انکشاف کیا کہ انصار و مہاجرین لیگ کو پھر سے تنظیم و ترتیب دینے کی سوچ رہے ہیں اور اس ضمن میں مناسب کاروائی ہو رہی ہے۔ اس پس منظر میں وزیر اعظم صاحب کا مقصد یہی ہو سکتا تھا کہ اگر مسلم لیگ پر قبضہ کرنے میں وہ ایک مرتبہ کامیاب نہیں ہوئے تو وہ باز نہیں آ گئے بلکہ اس پر قابض ہونے اور حریف کی ساختہ لیگ کی شکست و ریخت میں بدستور سرگرم و کوشاں ہیں۔

الٰہی بخش کے عزل کے بعد مسلم لیگ کے سامنے پھر ایک وزیر اعظم چننے کا مرحلہ آ گیا۔ اسمبلی پارٹی کا ہر رکن اس منصب کے حصول کا متمنی تھا اور کوشاں تھا۔ پارٹی میں تشتت اور افتراق حد درجہ کا تھا۔ جن حضرات کا اثر و رسوخ فراواں تھا انھوں نے اس افتراق میں اتحاد و اتفاق پیدا کرنے کی کوشش کی اور انفرادی طور پر ارکان سے اپنی اپنی حمایت میں قرآن پر ہاتھ رکھوا رکھوا کر حلف لئے۔ کہا جاتا ہے کہ کئی حضرات نے دس دس مرتبہ قرآن پر حلف اٹھائے اور متفرق امیدواران (رضاکاران ؟) وزارت عظمیٰ کو علیحدہ علیحدہ اپنی حمایت کا یقین دلایا۔ وزارت بازی اور وزارت سازی کے اس مشغلہ کا بالآخر یہ نتیجہ نکلا کہ سیٹھ یوسف ہارون کو اسمبلی پارٹی نے اپنا لیڈر چنا۔ سیٹھ صاحب صرف تین ووٹوں کی اکثریت حاصل کر سکے۔ تاہم غنیمت ہے کہ یہ ڈرامہ ختم ہوا۔ سیٹھ صاحب کے متعلق ایک آئینی دشواری تھی۔ آپ اسمبلی کے ممبر نہیں تھے اور گو آئین کی رو سے آپ کو وزیر اعظم تو بنایا جا سکتا تھا لیکن ضروری تھی کہ کچھ وقت کے بعد آپ انتخاب لڑ کر اسمبلی کے رکن بن جائیں۔ جب ادھر توجہ کی گئی تو معلوم ہوا کہ آپ اسمبلی کے ووٹر بھی نہیں ہیں۔ چنانچہ آپ نے حیدر آباد سے ووٹر بننے کے لئے درخواست دی۔ ایک صاحب نے اس کے خلاف عذر داری کر دی کہ قانونی طور پر جب تک آپ چھ ماہ تک حیدر آباد میں رہائش اختیار نہیں کرتے آپ ووٹر نہیں بن سکتے۔ چنانچہ اس پر سیٹھ صاحب نے فیصلہ کر لیا کہ وہ چھ ماہ تک حیدر آباد میں قیام فرمائیں گے اور اس کے بعد ووٹر بن کر اسمبلی کی رکنیت کے کوشاں ہوں گے۔ اس رہائش کے لئے ضروری تیاریاں ہو رہی تھیں اور غالباً ایک مکان پر آپ کے نام کا بورڈ بھی آویزاں کر دیا گیا تھا کہ ایک دن اچانک یہ خبر آ گئی کہ سیٹھ صاحب کو غیر معمولی مصروفیات نے اتنی مہلت ہی نہ دی کہ آپ ووٹروں کی فہرست کی پڑتال کر سکتے۔ آپ کو دراصل غلط فہمی

ہو گئی تھی، ورنہ آپ باقاعدہ ووٹر ہیں۔

مسلم لیگ اور مسلم لیگیوں کی سیاست کس ڈگر پر جا رہی ہے، اس کا ایک اور نمونہ ملاحظہ کیجئے۔ پچھلے دنوں خبر آئی کہ میر غلام علی تالپور جو اس وقت سندھ وزارت کے رکن ہیں، سندھ جاگیر دار ایسوسی ایشن کے صدر ہیں۔ ان دنوں جاگیرداری اور زمینداری کی مخالفت کا جو بازار گرم ہے اس کے پیش نظر یہ صدارت بدنام کن تھی، چنانچہ آپ نے اعلان کر دیا کہ مذکورہ ایسوسی ایشن سے آپ کا کوئی تعلق نہیں۔ ایسوسی ایشن کی طرف سے اس کا جواب دیا گیا کہ ایسوسی ایشن گذشتہ ۲۵ سال سے قائم ہے اور شروع سے ہی میر صاحب اس کے صدر چلے آ رہے ہیں۔ اور انھوں نے ابھی تک استعفیٰ نہیں دیا، اس کو جانے دیجئے کہ دونوں میں سچا کون ہے؟ سیاست کے اس فریب اور دروغ کا ماتم کیجئے جس نے سیاسی زندگی کو اس قدر زہر آلود کر دیا ہے۔ جو قوم اپنے قائدین کا محاسبہ نہیں کرتی اسے یونہی بیوقوف بنایا جاتا ہے۔

سندھ کے ایک اور مسلم لیگی قائد محمد ہاشم گذدر نے ایک سندھی کنونشن منعقد کرنے کا اعلان کیا ہے جو پاکستان میں سندھی حقوق و مفادات کے تحفظ کی تدابیر سوچے گی اور انھیں بروئے کار لائیگی۔ اس فیصلہ کی اطلاع صوبائی مسلم لیگ کو ملی تو معاملہ صدر پاکستان مسلم لیگ کے سپرد کر دیا گیا چنانچہ انھوں نے گذدر صاحب سے جواب طلبی کی ہے کہ وہ کیوں مسلم لیگ کے علاوہ ایک کنونشن کا قیام عمل میں لا رہے ہیں۔

کراچی اور سندھ کے سامنے جو گوناگوں مسائل ہیں، ان کو چھوڑیئے۔ صرف ایک مسئلہ کے ایک ہی گوشہ پر نگاہ ڈالئے۔ جولائی میں کراچی میں جو غیر متوقع اور غیر معمولی بارش ہوئی ہے اس سے کم و بیش پچاس ہزار پناہ گزین پھر سے پناہ گزیں ہو گئے۔ کچھ عرصہ ہوا پاکستان کے وزیر داخلہ و مہاجرین خواجہ شہاب الدین صاحب نے فرمایا تھا کہ پاکستان میں پناہ گزینوں کی آبادکاری و بحالی کا مسئلہ ختم ہو چکا ہے۔ یہ مسئلہ کس کامیابی سے ختم ہوا؟ اس کی قلعی بارش کے چند قطروں نے کھول دی۔ پچاس ہزار فلاکت زدہ، متاع بردہ انسانوں کا ہجوم بے رحم و بے قابو آب و ہوا کے سامنے خس و خاشاک بن گیا۔ انھوں نے بھاگ بھاگ کر سرکاری دفاتر اور دیگر ایسی عمارتوں میں پناہ لی۔ کسی وزیر، کسی لیگی لیڈر کو یہ توفیق ارزانی نہ ہوئی کہ وہ مصیبت زدگان کے حال زار کو بچشم خود دیکھتا اور ان سے لفظی ہمدردی ہی کا مظاہرہ کرتا۔

بلوچستان

سندھ کے بعد بلوچستان میں آیئے۔ بلوچستان جاہل، پسماندہ اور غیر ترقی یافتہ علاقہ ہے۔ بدیں وجہ اسے اس قابل نہیں سمجھا گیا تھا کہ اسے اصلاحات سے نوازا جائے۔ انگریز کے عہد حکومت میں مسلم لیگ کے مطالبات میں ایک مطالبہ یہ بھی تھا کہ بلوچستان کا سیاسی درجہ دیگر صوبجات کے برابر کر دیا جائے۔ قیام پاکستان کے بعد مارچ ۱۹۴۹ء میں پندرہ ارکان پر مشتمل مشاورتی کمیٹی قائم کرنے کا اعلان کیا گیا۔ اس "مجلس مشاورت" کو ہر سال گورنر جنرل نامزد فرمایا کریں گے۔ انہی میں سے تنخواہ دار مشیر

مقرر کئے جائیں گے۔ یہ اعلان ہوتے ہی صوبہ میں سیاسی سرگرمی شروع ہوگئی۔ مسلم لیگ کو اطمینان تھا ہی کہ حکومت اس کی ہے لہٰذا اس کے جملہ حقوق محفوظ رہیں گے۔ قبائلی سرداروں یا ان میں سے بعض نے (Tribes Federation) قائم کرکے اپنے اضطراب کا مظاہرہ کیا۔ ان کا دعویٰ ہے کہ وہ بلوچستان کی ۹۵ فیصدی آبادی کے نمائندہ ہیں۔ اس کا مطالبہ یہ ہے کہ صوبہ میں عمومی انتخابات کئے جائیں۔ عمومی انتخابات کا مطالبہ بالکل جمہوری مطالبہ ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ کیوں بلوچستان کو اس سے محروم رکھا جائے۔ اگر انگریز کے عہد حکومت میں اس قسم کی اصلاحات بلوچستان کو عطا ہوتیں تو مسلم لیگ شاید ہی انھیں قبول کرتی۔ بہرکیف مسلم لیگ اس دعویٰ کو تسلیم نہیں کرتی اور بلوچستان کی نمائندگی کو اپنا خصوصی اجارہ سمجھتی ہے۔ پہلی مجلس مشاورت میں ۹ مسلم لیگی ۵ قبائلی فیڈریشن کے نمائندے اور ایک اقلیتوں کا نمائندہ لیا گیا ہے۔ جب اس مجلس کی حلف وفاداری کی رسم ادا کی گئی تو اس میں بعض نمائندے شامل نہیں ہوئے۔ گو بعد میں باستثنائے اصیب آگئے اور مسلم لیگ میں بھی شامل ہوگئے لیکن یہ حقیقت ہے مسلم لیگ بغیر حریف کے نہیں ــــ اور حریف کا ہونا افتراق کا بین ثبوت ہے۔ قاضی عیسیٰ نے کہ مجلس مشاورت کے چیف ایڈوائزر ہیں، ۱۹ جولائی کو کوئٹہ میں تقریر کرتے ہوئے قبائلی فیڈریشن کو یقین دلایا کہ عنقریب عمومی انتخابات کئے جائیں گے اور اس انانیت کا بھی مظاہرہ کیا کہ مسلم لیگ (نہ کہ قبائلی فیڈریشن) دس سال سے صوبہ میں جمہوریت کے نفاذ کے لئے ساعی رہی ہے۔ اگر یہ سولی صدی صحیح ہو کہ جمہوریت کے نفاذ کی داعی اور ساعی مسلم لیگ ہی رہی ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جب جمہوریت کا نفاذ ہو یا اس کا پرتو پڑے تو جملہ اختیارات مسلم لیگ اپنے قبضہ میں کرلے۔ آخر مسلم لیگ کیوں مطالبہ کرتی تھی کہ بلوچستان کو اصلاحات سے نوازا جائے اور اس کا سیاسی مرتبہ دوسرے صوبوں کے مساوی کردیا جائے؟ کیا اس کا مقصد یہ تھا کہ بلوچستان کو اصلاحات میسر آگئیں تو ایک اور وزارت مسلم لیگ کے قبضہ میں آجائے گی؟ اگر یہ منشا نہیں تھا اور مسلم لیگ بلوچستان کے باشندگان کو خود حکومتی سے متعارف کرنا چاہتی تھی تو کوئی وجہ نہیں کہ اب جبکہ اصلاحات کی حقیری قسط صوبہ کو ملی ہے تو اس سے حاصل ہونے والے اختیارات کو ایک سیاسی پارٹی بدیں وجہ اپنے قبضہ میں کرلے کہ وہی ان اصلاحات کا مطالبہ کرتی رہی ہے۔ سیاسی حقوق کے مستحق عوام الناس ہوتے ہیں نہ کہ سیاسی پارٹیاں۔ قاضی عیسیٰ کا یہ کہنا کہ مسلم لیگ ہی بلوچستانی اصلاحات کی داعی رہی ہے اور اس سے بزعم خود یہ استنباط کرنا کہ صرف مسلم لیگ ہی سیاسی اقتدار کی اجارہ دار ہے بداہتاً غلط ہے اور خلاف جمہوریت۔ لیکن یہیں سے مسلم لیگی لیڈروں کی ذہنی کیفیت آشکارا ہوتی ہے اور مسلم لیگ کے سیاسی میلانات کا پتہ چلتا ہے۔ مسلم لیگ نے جو سیاسی جدوجہد ملت کی تائید سے کی ہے اس کے ماحصل کو وہ مال غنیمت سمجھ کر بلاشرکت غیرے اپنانا چاہتی ہے۔ لیگ کو ابھی اس حقیقت ثابتہ کو سمجھنا ہے کہ ایک سیاسی

پارٹی اور جمہور یا ملت کا تعلق جزو اور کل کا تعلق ہے اور جز کل کے مساوی نہیں ہوتا۔

مغربی پنجاب مغربی پنجاب میں مسلم لیگ اور مسلم لیگیوں کے ہاتھوں آئین و جمہوریت کی جو مٹی پلید ہوئی ہے وہ صوبہ اور سیاسی جماعت دونوں کی زندگیوں کا غالباً تاریک ترین باب کہا جا سکتا ہے۔ کسی جمہوری ملک میں کوئی سیاسی جماعت ملک و ملت کو ایسے صریح دھوکے دے کر کبھی زندہ نہ رہ سکتی۔ مغربی پنجاب میں مسلم لیگ کے سیہ کارناموں پر تبصرہ وقتاً فوقتاً ہوتا رہا ہے۔ یہ موقع ان دہرائی ہوئی تفصیلات میں جانے کا نہیں۔

مغربی پنجاب کی سیاست اس ہوائی جہاز کی مانند ہے جو بغیر ہوا باز کے اڑتا ہے اور زمینی "کنٹرول روم" سے اس کی ہدایت و رہنمائی ہوتی ہے۔ بساط سیاست کے بعض مہرے جو بظاہر پٹ چکے ہیں وہ درحقیقت "کنٹرول روم" میں پہنچ چکے ہیں۔ اس بدقسمت صوبہ کی سیاست اسی "عالم امر" کا پرتو ہے۔ جو وزارت اور مقننہ کا تعطل ہوا ہے تو مسلم لیگی حلقوں میں بھی اس اقدام کا خیر مقدم کیا گیا تھا، لیکن جب انتخاب نو کا معاملہ سامنے آیا تو یہ تاثر کم ہو گیا اور ارباب لیگ کو محسوس ہوا کہ اس میں 'ہنسنے' کا سامان کم اور 'رونے' کا زیادہ ہے، کیونکہ دو ٹرم لیگ کے "شاندار کارناموں" کے باعث اتنے صید زبوں نہیں رہے تھے کہ محض لیگ کے نام پر ہی اپنے ووٹ نثار کر دیں، کبھی وہ لیگ کے 'کھمبے' کو بھی ووٹ دینے پر تیار تھے، اور اب وہ بڑے سے بڑے لیگی کو اپنے ووٹ کا مستحق نہیں سمجھتے تھے۔ اس نشتر کی نوک کی زد کہاں تک پڑتی تھی یہ چودھری خلیق الزماں کے ایک بیان سے پتہ چلتا تھا جو آپ نے ۸ مارچ ۱۹۴۹ء کو دیا اور جس میں کہا گیا کہ

> اگر مغربی پنجاب میں مسلم لیگ شکست کھا گئی تو اس کے اثرات اتنے دور رس اور نتائج اتنے سنگین اور پریشان کن ہوں گے کہ دوسرے صوبوں میں اس کے امکانات کامیابی مخدوش ہو جائیں گے۔ (لہٰذا) مسلم لیگ کے سامنے سوال موت و زندگی کا ہے۔ یا تو ہم مغربی پنجاب میں انتخابات جیتیں گے یا اسی کوشش میں مر جائیں گے۔

جب ایک سیاسی جماعت عرصۂ انتخابات میں آتی ہے تو وہ یا تو اپنا عمل پیش کرتی ہے یا آئندہ سے متعلق عزائم کا تفصیلی خاکہ۔ مسلم لیگ کے 'دفتر' میں کیا تھا؟ عمل؟ اٹھارہ مہینوں کی مسلم لیگی وزارت کی سیہ کاریاں اور بدنظمیاں! مستقبل سے متعلق عزائم؟ مسلم لیگ کو اقتدار و استیلا کی جنگ سے ہی کب مہلت ملی تھی کہ وہ مستقبل کی منصوبہ بندی کر سکتی۔ اسے وہ غیور و بصیر افراد کہاں سے میسر آتے جو حال کے تیور پہچانتے اور مستقبل کی قیافہ شناسی کرتے! تقسیم ہند سے فوری پہلے کے ہندو مسلم فسادات اور مابعد تقسیم کے غیر معمولی حادثات نے مغربی پنجاب (اور پاکستان) کو جن غیر معمولی حالات سے دوچار کر دیا تھا اس کا حل مسلم لیگ کے پاس نہیں تھا۔ اس کے برعکس مسلم لیگی وزارت نے ان مصائب میں اور اضافہ کیا۔ ان حالات میں مسلم لیگ دوٹروں کو کیا منہ

دکھاتی! لیکن چودھری خلیق الزماں کے ترکش میں تیروں کی کیا کمی! پہلے تو آپ نے صوبہ میں مسلم لیگ کی غیر ہر دلعزیزی کا ذمہ دار پولیس کو گردانا۔ گویا ممدوٹ کی وزارت اور دولتانہ کی صدارت کی کارستانیاں پولیس کی شرمندہ سی تھیں۔ اس کے بعد انفرادی مجرمین کی یوں پردہ پوشی کی۔

> آپ مسلم لیگ کی حمایت کیجئے۔ افراد کے مفاد کے لئے نہیں بلکہ جماعت کے مفاد کے لئے۔ وہ جماعت جسے قائداعظم بطور میراث چھوڑ گئے ہیں۔ . . . . . . افراد کے گناہوں کا اثر جماعت پر نہیں پڑنا چاہئے خصوصیت سے جبکہ اور کوئی عوامی جماعت موجود نہیں۔ (۵ مارچ ۱۹۵۹ء)

مسلم لیگ کے حق میں دلائل یہ ہیں:۔

۱) مسلم لیگ قائداعظم کی میراث ہے۔

۲) اور کوئی عوامی جماعت موجود نہیں۔

قائداعظم نے مسلم لیگ کے ذریعہ پاکستان حاصل کیا۔ قائداعظم کا ترکہ مسلم لیگ نہیں بلکہ پاکستان ہے۔ مسلم لیگ ذریعہ تھا جسے اب ترک کیا جا سکتا ہے۔ یہ رہا مسلم لیگ کے جواز کا 'اثباتی' پہلو۔ سلبی پہلو یہ ہے کہ کوئی اور جماعت موجود نہیں۔ لہٰذا ــــ گندم اگر بہم نہ رسد بھس غنیمت است۔

یہ بھی ملاحظہ فرمایئے کہ افراد کے گناہوں کا کفارہ جماعت کے نام سے ادا ہو رہا ہے۔ پارٹی بازی کا یہی طغرۂ امتیاز ہوتا ہے کہ وہاں افراد کے عیوب و محاسن نظر انداز کر دیئے جاتے ہیں اور صرف جماعتی حیثیت کو دیکھا جاتا ہے۔ یعنی ان حضرات کی سیاست میں جماعت، افراد کے مجموعے کا نام نہیں ہوتی۔ عرش سے ٹپکی ہوئی مقدس روح ہوتی ہے جسے ان افراد کی خباثتیں ہرگز آلودہ نہیں کر سکتیں جن پر وہ جماعت مشتمل ہوتی ہے۔ ان کے نزدیک جماعت کے افراد خواہ سب کے سب مردود و مطرود ہوں جماعت بہرحال معصوم رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کہتے ہیں، یہ نہ دیکھو کہ فلاں شخص جو ووٹ طلب کر رہا ہے کن خوبیوں کا مالک ہے اور اس کی شخصی قدر و قیمت کیا ہے، بلکہ صرف یہ دیکھو کہ وہ کس جماعت سے متعلق ہے۔ لیکن جب افراد جماعت کے نام پر ووٹ لیکر مسانید حکومت پر فائز ہوتے ہیں تو ان کے اصلی خد و خال نمایاں ہو جاتے ہیں اور ان کے حقیقی عیوب ابھر آتے ہیں۔ اس طرح جماعتیں بتدریج افراد کی کارگزاری کے ہاتھوں بدنام ہو جاتی ہیں اور ان کی بحالی کی صلاحیت مفقود ہو جاتی ہے۔ ایسی جماعتیں افراد کے عیوب کو نہیں ڈھانپ سکتیں۔ یہی حال اس وقت مسلم لیگ کا ہے۔ مغربی پنجاب میں جو لیگی قائد وزارت یا جماعت کی طرف سے سامنے آئے ان میں سے ہر ایک نے ایک ہی طرح کا فساد پھیلایا ہے۔ لیکن آج چودھری صاحب ان کے گناہوں پر مسلم لیگ کے پردے ڈال رہے ہیں اور پھر جماعت کے نام پر ووٹ کی دہائی دے رہے ہیں۔ یہ عجیب مذاق ہے کہ افراد کے گناہوں کی پردہ پوشی کے لئے تو جماعت آ موجود ہوتی ہے لیکن ان کے جوہر ابھارنے یا اصحاب جوہر کو صف اول میں لانے کے لئے کچھ نہیں ہوتا۔ شاید کسی پارٹی کے

نابختہ پن کی قطعی دلیل ہوتی ہے۔

مغربی پنجاب میں مسلم لیگی وزارت اور صدارت نے سیاسی زندگی میں جو شور پیدا کیا ہے اس پر وقتاً فوقتاً تبصرہ ہوتا رہا ہے۔ یہ وقت ان تفاصیل میں بھرسے جانے کا نہیں۔ اس تبصرہ کو ہم مسلم لیگ کے جماعتی نظم اور حکومت اور پارٹی کے تعلق تک محدود رکھتے ہیں۔

پاکستان کی مرکزی حکومت اور جملہ صوبائی حکومتیں ابتداءً آل انڈیا مسلم لیگ نے مرتب کی تھیں جواب مرحوم ہو چکی ہے۔ پاکستان مسلم لیگ اس مرحوم کی جانشین ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ حکومتیں (مرکزی اور صوبائی) اسی کی مرتب کردہ ہیں، اسی کے نظام کے ماتحت ہیں اور اسی کے طریق کار پر عامل۔ لفظی طور پر یہ تو ٹھیک ہے کہ یہ حکومتیں مسلم لیگ کی مرتب کی ہوئی ہیں لیکن نظام اور طریق کار مسلم لیگ کے پاس کہاں؟ کسی منصوبہ بندی اور وحدت و استقلال پاکستان کے لائحہ عمل سے مسلم لیگ کا دامن اس قدر تہی ہے کہ حال ہی میں اخباری نمایندوں نے جب چودھری صاحب سے باصرار پوچھا کہ مسلم لیگ کا پروگرام کیا ہے تو آپ نے تنگ آ کے فرمایا کہ اگر پروگرام ہی درکار ہے تو فلاں اخبار کے پاس جائیے یا پھر کمیونسٹوں کے پاس۔ جہاں تک مسلم لیگ اور حکومت کا تعلق ہے عملاً ایسا نظم و ضبط موجود نہیں، اور اگر کاغذات میں وہ کہیں موجود بھی ہے، تو وہ کارفرما نہیں۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ان کا باہمی رشتہ کیا ہے اور کون کس کے تحت ہے اور کس حد تک! چنانچہ حال ہی میں مغربی پنجاب مسلم لیگ نے جو ڈھونگ رچایا اس سے یہ سارا پول کھل جاتا ہے۔ پارٹی طرز حکومت کے دستور کے مطابق ہونا تو یہ چاہیئے کہ مرکزی حکومت کی مرتب اور محاسب مرکزی مسلم لیگ ہو اور صوبائی حکومتوں کی صوبائی مسلم لیگیں۔ صوبائی مسلم لیگیں چونکہ آخر کار جماعتی حیثیت سے مرکزی مسلم لیگ کے ماتحت ہیں، اس لئے حکومتوں اور مسلم لیگوں (مرکزی اور صوبائی) کا باہمی تعلق ایک ہی ضابطہ کے مطابق ہونا چاہیئے۔ چنانچہ جو مسائل صوبوں سے متعلق ہیں ان کا حل صوبائی مسلم لیگ اور صوبائی وزارت کرے اور پاکستان بھر سے متعلق مسائل اور مرکزی حکومت اور مرکزی لیگ حل کرے اور پالیسی مرکز اور صوبوں میں یکساں طور پر مرکزی مسلم لیگ کی طے کردہ ہو۔

مغربی پنجاب میں جب گورنر راج قائم ہوا ہے تو وزیر اعظم پاکستان نے صوبائی مسلم لیگ کے وفد کو دعوت دی کہ وہ مشیروں کی فہرست ان کو دیں۔ یہی دعوت کراچی میں پھر وزیر اعظم نے صوبائی لیگی لیڈروں کے سامنے پیش کی۔ قواعد کے مطابق مرکزی وزیر اعظم کے صوبائی لیگ سے براہ راست مذاکرات نہیں ہونے چاہئیں تھے۔ مرکزی حکومت کو چاہیئے تھا کہ وہ اس قسم کی پیش کش یا اور جو بھی حل مناسب سمجھا جاتا مرکزی مسلم لیگ کے روبرو پیش کرتی اور مرکزی مسلم لیگ صوبائی لیگ کے مشورے سے تصفیہ کرتی۔ یہ مذاکرات بالکل دو اشخاص یعنی لیاقت علی خاں اور عبدالباری کے مابین ہوئے۔ طرفہ تعجب یہ ہے کہ مرکزی لیگ ان مذاکرات سے آگاہ ہوتے ہوئے بھی خاموش رہی اور اس نے مداخلت نہیں کی، حالانکہ وہ ایسا کرنے میں حق بجانب تھی۔ اس کی

حیثیت اور آبرو کا یہی تقاضا تھا۔

یہ انفرادی مذاکرات پس پردہ ہوتے رہے۔ لیکن ان کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۲۲ مئی کو صوبائی مسلم لیگ نے ایک قرارداد منظور کی جس میں گورنر موڈی کی برطرفی کا مطالبہ کیا۔ سوال یہ ہے کہ یہ مطالبہ کس سے کیا گیا؟ کسی گورنر کے تقرر اور برطرفی کا مجاز گورنر جنرل ہے۔ لہٰذا اس مطالبہ کی مخاطب مرکزی حکومت ہو سکتی تھی۔ لیکن جب روئے سخن مرکزی حکومت کی طرف ہوا تو صوبائی لیگ کو اپنی مرکزی لیگ کی وساطت سے مرکز تک پہنچنا چاہیے تھا۔ مرکزی حکومت سے مرکزی لیگ ہی گفتگو کرنے کی مجاز ہو سکتی ہے۔ ادھر صوبائی مسلم لیگ نے یہ قرارداد اخبارات میں شائع کر دی ادھر وزیر اعظم پاکستان نے اس کا براہ راست جواب دیدیا اور وہ بھی اخبارات کی وساطت سے۔ صوبائی لیگ کہہ رہی ہے کہ گورنر لیگ کو ختم کر دینا چاہتا ہے اور مرکزی وزیر اعظم فرما رہے ہیں کہ وہ وفاداری اور صدق دلی سے مفوضہ فرائض سرانجام دے رہا ہے۔ مرکزی لیگ جو مغربی پنجاب کے مسئلہ کو پاکستان بھر میں لیگ کے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ قرار دے چکی تھی، وہ خاموشی اور مجہول تماشائی تھی۔ کیا مرکزی لیگ میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ کسی ایک فریق کی حمایت کرتی؟ فریقین کے بیانات بالکل متضاد تھے اور دونوں میں ایک فریق ہی سچا ہو سکتا تھا۔ مرکزی مسلم لیگ کسے خوش کرتی اور کسے ناخوش؟

وزیر اعظم کے جواب میں صوبائی مسلم لیگ نے جو قرارداد مرتب کی اس میں کہا گیا کہ اختیارات کا سرچشمہ مسلم لیگ ہے، لہٰذا وزیر اعظم مسلم لیگ کو مجبور نہیں کر سکتا کہ وہ کسی معاملہ میں کوئی رائے قائم کرنے سے پیشتر وزیر اعظم سے رائے قائم کرنے کی اجازت حاصل کرے۔ یہ اصولی سوال تھا۔ کون کس کے سامنے جواب دہ تھا؟ مرکزی مسلم لیگ نے اس کا حتمی فیصلہ مناسب نہ سمجھا۔ ورنہ یہ کارزار ایک مرتبہ صاف ہو جاتا تو آئندہ کے لئے قواعد و ضوابط واضح اور قطعی ہو جاتے۔

بہرحال صوبائی مسلم لیگ نے ایک صوبائی نزاع چھیڑی اور مقامی گورنر یعنی موڈی پر الزامات عائد کئے۔ ۵ جون کو صوبائی کونسل کا اجلاس منعقد ہوا جس میں عاملہ کی ۲۲ مئی کی قرارداد کی توثیق کی گئی۔ کونسل نے اس دن قرارداد کی توثیق کی اور دونوں قراردادیں منظور کیں۔ ایک کا مضمون یہ تھا کہ پاکستان کو دولت مشترکہ سے باہر آجانا چاہیے اور دوسری کا مضمون یہ کہ تمام کلیدی آسامیاں پاکستانیوں کے ہاتھوں میں ہونی چاہئیں۔ یہ رونئے شوشے بدیں وجہ چھوڑے گئے کہ موڈی کی برطرفی کے سلسلہ میں صوبائی مسلم لیگ نے جو متضاد روش اختیار کر لی ہے اس میں مطابقت پیدا ہو جائے! مسلم لیگ نے ایک طرف گورنر موڈی پر الزامات لگائے اور دوسری طرف پاکستانی گورنر کے تقرر کا مطالبہ کیا۔ اگر مقصود موڈی کے مزعومہ مثبت گناہوں کا تدارک تھا تو یہ مقصد موڈی کی برطرفی سے حاصل ہو سکتا تھا۔ یہ معاملہ محض انفرادی تھا۔ لیکن جہاں تک پاکستانی گورنر کے تقرر کا تعلق تھا

وہ اصولی سوال تھا اور اسے مرکزی مسلم لیگ ہی اٹھا سکتی تھی، کیونکہ یہ معاملہ پالیسی کا ہے جس میں صوبہ مشورہ دے سکتا ہے لیکن وہ پالیسی متعین نہیں کر سکتا۔ یہی صورت دولتِ مشترکہ سے وابستگی کے سوال سے متعلق ہے۔ یہ مطالبے محض عام جذبات کے رخ کو دیکھ کر مسلم لیگ نے اٹھائے، کیونکہ اس سے عام جذباتی "تائید" کی توقع کی جا سکتی تھی، اور اپنے تضاد کو چھپایا جا سکتا تھا۔ اس طرح مسلم لیگ نے اپنی پوزیشن متضاد اور مضحکہ خیز بنالی۔ اگر مسلم لیگ اصولی نقطۂ نگاہ سے موڈی کی برطرفی اور پاکستانی گورنر کے تقرر کا مطالبہ کر رہی تھی تو خواہ موڈی کا طرزِ حکومت بہتر بھی ہوتا تو بھی یہ مطالبہ کیا جا سکتا تھا۔ اس کے لئے یہ ضروری نہیں تھا کہ موڈی پر جبر و تشدد یا سازش کے الزامات لگائے جاتے۔ نیز اس کے ساتھ سرحد اور مشرقی بنگال کے غیر پاکستانی گورنروں کا سوال بھی اٹھایا جانا چاہئے تھا۔ لیکن مجلس عاملہ نے محض موڈی کی برطرفی کا مطالبہ کیا اور جب اس تضاد پر نکتہ چینی ہوئی تو کونسل نے دولتِ مشترکہ اور کلیدی آسامیوں سے متعلق عاجلانہ طور پر قرارداد میں منظور کر دیں اور اس طفلانہ انداز سے مجلس عاملہ کی فروگذاشت کی بزعم خویش تلافی کی۔

ایک طرف تو بیان بازی سے اخبارات میں یہ ہنگامہ آرائی شروع کر دی گئی اور دوسری طرف "لیاقت باری" ملاقاتیں شروع ہو گئیں۔ سابقہ اشاعت میں بتایا جا چکا ہے کہ اخبارات کو بیان دیتے ہوئے کس طرح تلبیس سے کام لیا گیا۔ باری صاحب نے بعض اہم امور کا مجلس عاملہ میں تو ذکر کر دیا لیکن کونسل میں اخفا سے کام لیا۔ ولایت علی خاں جنرل سکرٹری مغربی پنجاب مسلم لیگ نے جب تین رفقا کے ساتھ استعفا دیا ہے تو انھوں نے اپنے بیان میں بتایا کہ لیاقت علی خاں کے بیان کے بعد جب باری کراچی ان سے ملے ہیں تو وہ یہ عہد کر کے لاہور لوٹے کہ "قرارداد موڈی" پر عملی کارروائی نہیں کی جائے گی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ "اعتراف" ۴ جون کو مجلس عاملہ کے اجلاس میں کیا گیا۔ اگر یہ صحیح ہے تو کونسل کو اس سے بے خبر رکھا گیا۔ باری نے کونسل کو یہ بھی نہیں بتایا کہ وزیر اعظم پاکستان نے مشیروں کی فہرست طلب کر رکھی ہے۔ ان رازوں کو مزید مخفی رکھنے کے لئے یہ اہتمام کیا گیا کہ مجلس عاملہ کی ایک قرارداد کی رو سے ارکان عاملہ کو مجبور کر دیا گیا کہ وہ عاملہ کی منظور شدہ قراردادوں کی ہر نوع کونسل میں حمایت کریں۔

اس قضیہ کا جو فیصلہ ہوا وہ بھی دو اشخاص یعنی لیاقت علی خاں اور عبدالباری کے مابین ہوا، چنانچہ اسے عرفِ عام میں "لیاقت باری" فارمولا ہی کہا جاتا ہے۔ تصفیہ ہو جانے کے بعد البتہ مرکزی مسلم لیگ نے بھی کروٹ لی اور چودھری خلیق الزماں نے ایک اخباری بیان کی معرفت اس تصفیہ پر اظہارِ اطمینان کیا۔

سرحد مغربی پنجاب کی اس دلدل سے نکل کر سرحد کے سنگلاخ علاقہ میں آئیے۔ یہاں خان عبدالقیوم وزارت پر متمکن ہیں اور ہنگامی قوانین کو بے محابا استعمال کر کے پاکستان کی وحدت، برقرار رکھ رہے ہیں۔ انھیں اپنے ہنگامی قوانین اور غیر معمولی اختیارات پر اس قدر گھمنڈ ہے کہ پچھلے دنوں ایک بیان

میں پنجاب کے بعض ان اخبارات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہ جان پر نکتہ چینی کے عادی ہیں، آپ نے فرمایا کہ اگر یہ اخبارات سرحد میں ہوتے تو ان کو فوراً شٹ اپ کر دیا جاتا۔ وزارتی پارٹی نے مسلم لیگ کے انتخابات میں عوام الناس کے ہر دلعزیز قائدین کو کس طرح مسلم لیگ کے حلقہ سے دور رکھا اس کا جائزہ "مسلم لیگ کی تنظیم جدید" والے مضمون میں لیا جا چکا ہے۔ وزارتی پارٹی کی مخلوق مسلم لیگ وزارت کی محافظ اور نقیب ہی کے فرائض سرانجام دے سکتی ہے۔ وزیر اعظم صاحب نے سستی ہر دلعزیزی حاصل کرنے کے لئے جاگیروں کی منسوخی کا فیصلہ کر رکھا ہے۔ یہ فیصلہ مستحسن ضرور ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ ضروری مسئلہ زمینداری کی تنسیخ ہے۔ زمینداری کے مقابلہ میں جاگیریں بہت کم ہیں۔ اس فیصلہ کو بطور پروپیگنڈہ استعمال کیا جا رہا ہے اور وزارت کے نکتہ چینیوں کو بدنام کیا جا رہا ہے۔ صوبہ میں دار و گیر کا عام سلسلہ جاری ہے۔ مسلم لیگ کے دیرینہ کارکن سطحی اور غیر وقیع الزامات کی بنا پر حوالۂ قید و بند کئے جا رہے ہیں۔ حال ہی میں پیر زاکوڑی شریف کو کہ جن کی خدمات استصواب سرحد کے سلسلہ میں بھی اور اس سے پیشتر بھی مسلم لیگ کے لئے بے بہا تھیں۔ تین سال کے لئے جیل میں ٹھونس دیا گیا ہے۔ مخالفین قیوم نے عوامی مسلم لیگ کی بنا ڈال دی ہے، جس کا مطالبہ ہے کہ صوبہ میں عمومی انتخابات منعقد کئے جائیں۔

بہر حال ہم کہہ یہ رہے تھے کہ سرحد میں مسلم لیگ کے ارباب حل و عقد اس عوامی لیگ کو مفسدہ انگیزوں کی جماعت قرار دے رہے ہیں کیونکہ انھوں نے "ملت" میں تفرقہ پیدا کرنا شروع کر دیا ہے۔ لیکن ایسا کہتے وقت وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ ـــــ اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ تست۔ اس تفرقہ کی بنیاد سب سے پہلے خود مسلم لیگ نے رکھی جس نے ملت میں ایک پارٹی کا وجود الگ قائم کر دیا۔ جب ملت میں ایک پارٹی کا وجود جائز ہے تو ایک سے زیادہ کا کیوں جائز نہیں۔ یا تو ملت میں کوئی پارٹی بھی نہیں ہونی چاہئے اور اگر آپ پارٹی بناتے ہیں تو پھر دوسری پارٹیوں سے گھبراتے کیوں ہیں! مسلم لیگ کے پاس کونسی خدائی سند ہے جس سے دوسری پارٹیاں محروم ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ "البادی اظلم" کے اصول کے مطابق مسلم لیگ اس تمام تفرقہ کی ذمہ دار ہے جو ملک میں پیدا ہو رہا ہے اور جو اس کے بعد پیدا ہوگا۔ ہمارے نزدیک نہ مسلم لیگ کا وجود صحیح ہے نہ عوامی لیگ کی تحریک انسب۔ مسلم لیگ نے تفرقہ کی ابتدا کی ہے اور عوامی لیگ اس کا ردِ عمل ہے۔ ملت کی فلاح صرف اس میں ہے کہ پوری کی پوری ملت ایک جماعت ہو اور بس۔ اگر بایں نرسیدی تمام بولہبی است۔

وزارت عوام میں یقیناً ہر دلعزیز نہیں رہی اور محض سیفٹی ایکٹ کے بے دریغ استعمال سے قائم اور مستحکم ہے۔ صوبہ کی مقننہ میں اسے "آئینی" اکثریت حاصل ہے اور وہ اپنی ہر دلعزیزی کا یہی ثبوت پیش کرتی ہے۔ یاد رہے کہ موجودہ مقننہ سنہ ۱۹۴۶ء کے انتخابات کا ماحصل ہے اور اس میں کانگریس کی اکثریت تھی۔ خان وزارت کی برطرفی کے بعد یہ لوگ مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ جمہوری قواعد کے مطابق یہ لوگ عوام کے نمائندے نہیں رہے۔

لہٰذا مقننہ کے اندر مصنوعی اکثریت اور بٹے ہے اور عوام میں ہر دلعزیزی اور ہے۔ سرحد کی وزارت اور لیگ کے باہمی تعلق پر تبصرہ دشوار ہے کیونکہ وہاں وزارت ہے لیگ نہیں۔ یعنی وہاں کی سیاست مسلم لیگ کی نہیں بلکہ وزارت کی ہے۔

مشرقی بنگال مشرقی بنگال قریباً کتاب مختوم رہا۔ لیکن حال ہی میں صوبائی اسمبلی کے ضمنی انتخاب میں مسلم لیگ کے نمائندہ نے پاکستان میں پہلی شکست کھائی۔ اتنے سے جھونکے سے ہوا کے رخ کا قیاس کیا جا سکتا تھا لیکن مسلم لیگ ان اصحاب بصیرت سے یکسر محروم ہے جو حقیقت کو برأی العین دیکھیں اور اس کا کما حقہٗ اعتراف کریں۔ مسلم لیگی حلقوں نے اس شکست کی متعدد توجیہیں کیں لیکن شکست کی حقیقت کو بدلا نہیں جا سکتا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد اچانک ایک اور حیران کن خبر آئی۔ مولانا اکرم خاں صدر مشرقی بنگال مسلم لیگ نے استعفا دے دیا! استعفا کی وجوہ؟ وزارت سے شدید اختلافات!! ہر چند اختلافات کی تفصیلات یا استعفا کی صحیح وجوہات منظر عام پر نہیں آئیں لیکن اتنے اشارے سے صورت حالات کو بھانپا جا سکتا ہے۔ یہ خبر سنتے ہی چودھری خلیق الزماں بجلی کی طرح ڈھاکہ پہنچے۔ صوبائی لیگ کا جلسہ منعقد ہوا۔ چودھری صاحب بھی شریک ہوئے۔ لیکن جلسہ گاہ میں وہ ہلڑ مچا کہ ہر وہ چیز جس پر ہاتھ پڑ سکتا تھا اور دوسرے پر پھینکی جا سکتی تھی اسے بے تکلفی سے استعمال کیا گیا۔ خیر یہ ہنگامہ فرو ہوا تو چودھری صاحب کے بیان کے مطابق "مشرقی بنگال مسلم لیگ نے اپنے اختلافات ختم کر دیئے۔ مولانا اکرم خاں نے اپنا استعفا واپس لے لیا ــــ اور قدرتی طور پر اس سے مسلم لیگ میں نئی جان آ گئی ہے اور مجھے دلی توقع ہے کہ یہ تعاون ہمیشہ برقرار رہے گا"۔ مسلم لیگ کے معتمد ارکان نے طویل عرصہ کی بے عملی کے بعد جو جسمانی کرتب دکھائے اور اعضاء و جوارح کی ورزش کی، اس سے "قدرتی طور" پر جسد لیگ میں نئی جان آ گئی ہو گی۔ اب یہ "تعاون" کیوں ہمیشہ برقرار رہے گا کیونکہ

بڑا مزا اس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر

اس ہنگامہ میں جمہور کو بالکل خاطر میں نہیں لایا گیا اور کسی جانب سے بھی اس کی حقیقی علت بیان نہیں کی گئی۔ یوں کہنے کو تو ہم جمہوری طرز حکومت کے زیر سایہ رہتے ہیں۔ خود قرارداد مقاصد میں بھی یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ حکومت کو خدائی نیابت ملت کی وساطت سے حاصل ہوئی لیکن ملت کو کوئی مخاطب کرنے کا روادار نہیں ہوتا اور سیاسیین کے تمام فیصلے پس پردہ ہوتے ہیں۔ ان حالات میں حکومت اور عوام میں خلا پیدا ہو جائے تو کسے تعجب ہو گا اور اگر کہا جائے کہ خلا موجود نہیں تو کسے یقین آئے گا!

مشرقی بنگال کی پوزیشن بڑی اہم ہے۔ چین، مغربی بنگال اور برما میں کمیونسٹ آگ کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔ چین اس آگ میں قریباً جل چکا ہے۔ اس آگ کی ہمہ گیر تباہی کے پیش نظر برما اور ہندوستان کا انجام ظاہر ہے۔ مشرقی بنگال! لیکن "کمیونزم، اسلام کا کیا مقابلہ کر سکتا ہے"! صوبہ کی غذائی حالت نازک ہے اور کپڑے

اس کے کہ اس کی اصلاح کی جانب کما حقہ اور فوری توجہ کی جائے اسے بطور حربہ سیاست استعمال کیا جا رہا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ غذائی حالت خراب ہے۔ لیکن اس کے متعلق متضاد بیانات شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ایک حضرت غذائی حالت کو تشویشناک کہتے ہیں اور دوسرے تسلی بخش۔ ایک بیان میں کہا جاتا ہے کہ یہ دیکھئے! سستے چاول مشرقی بنگال پہنچ لیں تو کمیونسٹ لمحہ بھر میں وہاں سے غائب ہو جائیں گے۔ دوسرے میں کہا جاتا ہے کہ کمیونسٹ تو یہاں ہیں ہی نہیں۔

۲۹ رجون کو چودھری خلیق الزماں نے غذائی حالت کو نازک قرار دیتے ہوئے کہا کہ اگر فوری کارروائی نہ کی گئی تو صورت حال اور بگڑ جائے گی سے یہ نہ سمجھ لیجئے کہ بھوکوں کی بھوک میں اضافہ ہو جائے گا یا بھوکوں کی تعداد بڑھ جائے گی بلکہ مخالف لیگ عناصر اس مصیبت کا فائدہ اٹھا رہے ہیں اور اسے مفید مطلب بنا رہے ہیں۔ گویا غذائی حالت میں اصلاح نہ ہوئی تو مسلم لیگ کی "حالت اور بگڑ جائے گی"۔ بالفاظ صحیح مزید غذا کی فراہمی اس لئے ضروری نہیں کہ فاقہ کشوں کی گرسنگی کا علاج ہو بلکہ اس لئے کہ مسلم لیگ کا کوئی حریف نہ پیدا ہو سکے اور یہ عصا ہوا "جسد سلیمانی" دیمک زدہ لاٹھی کا سہارا لئے کھڑا رہے!

مشرقی بنگال میں بھی عوامی مسلم لیگ قائم ہو گئی ہے۔ اس کے قیام میں بھی مسلم لیگ کے صدر کو اپنی موت کے سامان نظر آ رہے ہیں۔ چودھری صاحب کے الفاظ میں "فضل الحق اور شمس الدین نے متوازی لیگ بنانے کی سازش کر لی ہے تاکہ وہ بالآخر مسلم لیگ کو ختم کر دیں"۔

ریاستیں صوبوں کے بعد پاکستانی ریاستوں کی باری آتی ہے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کی حکمت عملی ریاستوں کے معاملات میں عدم مداخلت کی تھی، چنانچہ ایک ریاستی مسلم لیگ علیحدہ بنائی گئی تھی۔ یہ ریاستی لیگ مسلم لیگ کے دوش بدوش کام کرتی رہی اور مسلم لیگ "غیر تحریری" طور پر اسے اپنا ریاستی بازو ہی سمجھتی رہی۔ قیام پاکستان کے بعد ریاستی لیگ نے ریاستوں اور ریاستیوں کا درجہ پاکستان اور پاکستانیوں کے برابر کرنے کے لئے ریاستوں میں اصلاحات اور جمہوریت کا مطالبہ شد و مد سے شروع کر دیا۔ یہ مطالبہ بالکل قدرتی تھا اور حق بجانب۔ والیان ریاست ان سیاسی مراعات کے کہاں روادار ہو سکتے تھے؟ قرون مظلمہ کی یہ مخلوق بیسویں صدی میں بھی انسانیت کے بڑے معصوم کی شکاری ہے۔ نواب نواز مسلم لیگ ان کو کیسے ریاستی مسلم لیگ کے سپرد کر سکتی تھی؟ خلیق الزماں کی مسلم لیگ نے اس کا حل تلاش کر لیا اور سابقہ معاون ریاستی لیگ سے استصواب کئے بغیر یہ حیران کن فیصلہ کر دیا کہ پاکستان مسلم لیگ براہ راست ریاستوں میں اپنی شاخیں قائم کرے گی۔ گویا ریاستی مسلم لیگ جو برسوں سے قائم ہے اور ریاستی باشندوں کے حقوق کے لئے مصروف کار رہی ہے اسے بالکل نظر انداز کر دیا گیا۔ اس اقدام کا نتیجہ یہی ہوگا کہ جس طرح مسلم لیگ کے ہاتھوں صوبوں میں نفاق و افتراق کے بیج بوئے گئے ہیں اسی طرح پاکستانی ریاستوں میں بھی مسلمانوں میں انتشار و تشتت کی صورت پیدا ہو جائے گی۔

اور خود چودھری صاحب!

فروری ۱۹۴۸ء میں چودھری خلیق الزماں کو مسلم لیگ کا ناظم مقرر کیا گیا اور پاکستان مسلم لیگ کی تنظیم جدید کا فریضہ ان کے سپرد کیا گیا۔ فروری ۱۹۴۹ء میں یعنی ایک سال بعد یہ مراحل طے ہوئے اور چودھری صاحب مسلم لیگ کے صدر "منتخب" ہو گئے۔ "آپ ہی کے الفاظ میں "پاکستان کے مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت "مسلم لیگ" کے صدارت کے قابل رشک ہونے کے کیا کہنے! معلوم ہوتا ہے کہ نظامت نے چودھری صاحب کے ذہن میں ایک خاص قسم کا ہیجان پیدا کیا۔ خود چودھری صاحب اس عجیب ذہنی ہیجان کا رخ متعین نہ کر سکے، بلکہ بتدریج اس دھارے نے اپنی راہ بنائی۔ نظامت کے دوران میں اور صدارت کے بعد چودھری صاحب نے جو بیانات اخبارات کو بغرض اشاعت دیئے یا جو تقاریر کیں ان کو یکجا کر کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ نہاں خانہ دماغ میں وہ کن کن پرپیچ راہوں سے گزرے۔ اگر یہ خیالات پختہ ہو کر ایک وقت معین کے بعد منظر عام پر آتے تو چودھری صاحب کے تضاد کا کسی کو گمان تک نہ ہوتا۔ شاید ہیجان عظیم کا اثر تھا کہ چودھری صاحب بلند آواز سے سوچنے پر مجبور تھے اور اس طرح جو کچھ ذہن میں آتا تھا بلا اختیار ان کی زبان سے ادا ہو جاتا تھا۔ ان متفرق بیانات کو طلوع اسلام کی اشاعت بابت مارچ ۱۹۴۹ء کے لمعات میں یکجا کیا گیا ہے، لہٰذا یہاں اعادہ کی ضرورت نہیں۔ صدر منتخب ہوتے ہی آپ کے پہلو میں اس خیال نے انگڑائی لی کہ مسلمانوں کی سب سے بڑی سلطنت کی سب سے بڑی بلکہ واحد سیاسی جماعت کی صدارت پاکستان کا ہی نہیں بلکہ تمام عالم اسلامی کی قیادت کا پیش خیمہ ہو سکتی ہے۔ چنانچہ آپ نے ارادہ ظاہر فرمایا کہ وہ "پرانے تعلقات تازہ کرنے" کے لئے انگلستان تشریف لے جائیں گے۔ اس کے ساتھ ہی آپ نے یہ تبلیغ شروع کر دی کہ "قرآنی حکومت" کسی ایک ملک میں "انفرادی" طور پر قائم نہیں کی جا سکتی بلکہ اس کے لئے شرط اول یہ ہے کہ تمام روئے زمین کے مسلمان اس نظام کے تحت میں آ جائیں۔ قیادت عالم اسلامی کی "دنیوی" ہوس پر یوں مذہب کا ملمع چڑھایا گیا۔

حال ہی میں ۲۴ جون کو ڈھاکہ میں مولانا اکرم کے استعفاء سے متعلق ہنگامہ سے فارغ[1] ہوتے ہی آپ نے مسلم ممالک پر للچائی ہوئی نگاہ ڈالی، (مشرقی بنگال تو آپ نے فتح کر ہی لیا تھا) اور فرمایا کہ مسلم ممالک کے خارجہ اور دفاعی امور کے لئے ایک مرکزی ادارہ کی ضرورت ہے۔ ممالک اسلامیہ میں ایک عوامی جماعت ہونی چاہئے اور اس کو معرض تشکیل میں لانے کے لئے مذاکرات کی ضرورت ہے۔ یکم جولائی کو آپ نے اس بیان کا تکملہ پیش کیا اور مشرق وسطیٰ اور انگلستان کے دورے کا ارادہ ظاہر فرمایا تاکہ "اسلامستان" کا قیام عمل میں

[1] واضح رہے کہ ڈھاکہ میں مسلم لیگ کے اجلاس میں جو ہڑبونگ مچی وہ چودھری صاحب کے دم قدم سے تھی۔ اگر وہاں آپ موجود نہ ہوتے تو نوبت یہاں تک نہ آتی۔ ارکان لیگ کی اکثریت کا مطالبہ یہ تھا کہ چونکہ اجلاس استعفیٰ پر غور کرنے کے لئے طلب کیا گیا ہے لہٰذا اسی موضوع پر بحث و تمحیص ہونی چاہئے لیکن چودھری صاحب اس سے پہلے فضا "سازگار" کرنا اور تقریر فرمانا چاہتے تھے۔ چنانچہ اس غیر متعلق امر پر اصرار کا نتیجہ ہنگامہ کی صورت میں نمودار ہوا۔

لایا جائے۔ اسی بیان میں آپ نے عرب لیگ پر رائے زنی کرتے ہوئے کہا کہ وہ عوام کی نہیں بلکہ حکومتوں کی لیگ ہے؎ تو گویا اب پاکستان مسلم لیگ کی تکوین ساخت سے فراغت حاصل کر کے چودھری صاحب اسلامستان کے قیام کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں! یہ عالمگیر مسلم لیگ کی تمہید ہے۔

یہ ہے خفیف سی جھلک پاکستان کی واحد سیاسی جماعت مسلم لیگ کی سیاست کی۔ ذاتی تعلق اور اغراض پرستی کا یہ گھناؤنا مظاہرہ اس حال میں ہو رہا ہے کہ نوزائیدہ پاکستان کے مفلوکانہ کندھوں پر کم و بیش ایک کروڑ فلاکت زدہ، ستم رسیدہ، مہاجرین کی آبادکاری اور بحالی کا کمرشکن بوجھ ہے۔ مہاجرین اور مقامی باشندوں کے معیار زیست کا یہ عالم ہے کہ فی کس آمدنی چند پیسے روز سے زیادہ نہیں اور اس پر بھی بے روزگاری اور بڑھ رہی ہے۔ یہاں فاقہ کش بھوک سے مرتے بھی ہیں اور خودکشی بھی کرتے ہیں۔ عریاں بدن اور نحیف و نزار انسان گوناگوں امراض کا شکار ہوتے ہیں اور نہ طبی امداد ہی ملتی ہے نہ مناسب اور کافی غذا۔ یہاں خواندگی کا تناسب آبادی بمشکل ۱۵ فیصدی ہے۔ یہ اور لاتعداد ایسے طاقت شکن مسائل ہیں کہ پاکستان برسوں کی شبانہ روز جد و جہد سے بھی ان سے عہدہ برآ نہ ہو سکے۔ مسلم لیگ ان سب مسائل کو اپنے عافیت کدوں کے نسیان خانوں کی زینت بنا رکھا ہے۔ ان "درون خانہ" ہنگاموں کی لیگ کو کیا خبر!

ان حالات میں آپ سوچیے کہ کیا اس مسلم لیگ کی آپ کو ضرورت ہے؟ کیا اب وقت نہیں آگیا کہ اس لاشے کو مناسب احترام کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے دفن کر دیا جائے؟ اس مرنے والی میں بہت سی خوبیاں تھیں، لیکن مری ہوئی لاش میں تعفن اور سڑاند کے سوا اور کچھ نہیں! اس کے ساتھ یہ بھی سوچیے کہ اگر اس جماعت کی ضرورت نہیں تو کیا اس کے بجائے کسی اور جماعت کی بھی ضرورت ہے؟ کیا واقعات کی رو یہ شہادت نہیں دے رہی کہ پارٹی بازی لعنت ہے اور اس کا نتیجہ فساد اور افتراق ہے اور بس۔ ہم جس صالح قیادت کے آرزومند ہیں وہ پارٹی بازی سے کبھی بروئے کار نہیں آسکتی۔ حزب بندی سے افراد کے جوہر نمایاں نہیں ہو سکتے، نہ افراد جوہر کی بنا پر ہی منظر عام پر آتے ہیں۔ پارٹی اچھی بھی ہو تو اس کا وجود دوسری پارٹیوں کو مستقل دعوت تشکیل ہوتا ہے۔ لہٰذا اس فتنہ و فساد کے باب کو بالکل بند رکھیے۔ یاد رکھیے ملت فی نفسہ ایک پارٹی ہے۔ اس کی مزید تقسیم ہلاکت ہے۔ لہٰذا پارٹیوں کے بتوں کو توڑیے اور ملت میں گم ہو جائیے

کہ یہی ہے امتوں کے مرض کہن کا چارہ!

؎ پاکستان مسلم لیگ کا صدر کہہ رہا ہے کہ عرب لیگ عوامی جماعت نہیں!!!

کل اگر حکیم بودے علاج سر خود نمودے!

علمائے ہند کا فیصلہ

جلوۂ ایماں دکھانے کی ضرورت ہی نہیں
کفر کی جانب سے جب دل میں کدورت ہی نہیں

دل کشی رکھتا ہے کتنی مغبچوں کا حسن بھی
بتکدے میں خوشنما پتھر کی مورت ہی نہیں

ناگری کو کیوں نہ دیں ترجیح نستعلیق پر
جب یہ خطان کی نظر میں خوبصورت ہی نہیں

آؤ ہم خود دین کو کر لیں سیاست سے جدا
جب سیاست میں قدم رکھنے کی صورت ہی نہیں

چھوڑیئے تنظیم ملت اور تدبیرِ جہاد
ہند میں اب ایسے کاموں کی ضرورت ہی نہیں

جس میں آدابِ جہانبانی کے بھی احکام ہیں
ہم سمجھ لیں گے کہ قرآں میں وہ سورت ہی نہیں

مدعائے دل تھی آزادی سو حاصل ہو گئی
اب ہمیں آزاد رہنے کی ضرورت ہی نہیں

اسد ملتانی

بقیہ لمعات (صفحہ سے آگے۔) کمیٹی اس کا جواب یہ دیتی ہے کہ

ہمارے خیال میں زرعی معاشیات عادلانہ اور متوازیانہ بنیاد پر اسی صورت میں قائم رہ سکتی ہے جب اس اصول کو بلا استثنا تسلیم کر لیا جائے کہ زمین پر کسی کا حق جائز تسلیم نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ وہ زمین کی فلاحت (کاشتکاری) اور قومی دولت کی پیداوار میں براہ راست اضافہ نہ کرے۔

یعنی زمین پر اس کا حق تسلیم کیا جا سکتا ہے جو براہ راست اس سے پیداوار حاصل کرے اور اس طرح قومی دولت میں اضافہ کا ذریعہ بنے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کمیٹی کے خیال میں زمین کا حق اسی کو دیا جا سکتا ہے جو اسے خود کاشت کر سکے۔ اس اصول کے ماتحت صرف خود کاشت زمین پر کسی کا حق تسلیم کیا جا سکتا ہے تو پھر

(۱) جو زمین اس وقت کاشتکاروں کے زیر کاشت ہے اس پر زمینداروں کا حق کیا ہے کہ انہیں معاوضہ دلایا جا رہا ہے؟ دنیائے عدل و انصاف میں بھی غصب کردہ حقوق کا معاوضہ بھی دلایا گیا ہے؟

(۲) جب ۲۵ ایکڑ کی تحدید خود کاشت پر لگا دی گئی ہے تو ۱۵۰ اور ۵۰۰ ایکڑ پر حق ملکیت کے کیا معنی ہیں۔

(۳) اور شق ۳ کی رو سے ۲۵ ایکڑ سے زائد زمین کا معاوضہ حکومت کی طرف سے کیوں دلایا جا رہا ہے؟ اگر چور کے قبضہ سے بیل برآمد ہو تو کیا حکومت چور کو بیل کی قیمت ادا کر کے اسے اس کے جائز مالک کے حوالہ کرے گی۔

آپ نے غور فرمایا کہ یہ سفارشات، جو بظاہر غریب کاشتکاروں کے جذبۂ ہمدردی کے پیازی آنسوؤں (یعنی وہ آنسو جو پیاز کے ذریعے آنکھوں میں لائے جائیں) کے ساتھ پیش کی جا رہی ہیں۔ بڑے بڑے زمینداروں کو سرمایہ پرستوں کی ایسی جماعت میں منتقل کر دینے کا ذریعہ ہیں جنہیں کاشتکاروں کے نت نئے جھگڑوں کی دردسری سے بھی چھٹکارا مل جائے اور اس روپے سے وہ بڑے بڑے کارخانے کھول کر غریبوں کا خون، اوک کی بجائے پیالوں سے پینے لگ جائیں۔ یاد رکھئے نوع انسانی کی حقیقی دشمن، سرمایہ پرستی ہے جسے اسلام مٹانے کے لئے آیا تھا، نہ کہ اس کی کوئی خاص شکل۔ زمینداری اس کی ایک شکل ہے، کارخانہ داری دوسری شکل۔ ایک شکل کو دوسری شکل میں تبدیل کر دینا مرض کا علاج نہیں، نزلہ کو روک کر سل پیدا کر دینے کا موجب ہے۔ مرض کا حقیقی علاج اسی نسخہ میں ہے جسے حکیم مطلق نے "شفاء لما فی الصدور" (دل کے روگوں کا علاج) بتایا ہے۔ اور نسخہ یہ ہے کہ

(۱) ہر قسم کا سرمایہ خدا کی ملکیت ہے۔

(۲) خدا نے اسے بغرض ربوبیت نوعِ انسانی ملت اسلامیہ کے سپرد کیا ہے۔ لہٰذا یہ پوری کی پوری ملت کی تفویض میں ہے۔

معتقدات

(بسلسلہ اسباب زوال امت)

(شمس العلماء حافظ سید محب الحق صاحب مدظلہ العالی)

مخدوم و مکرم جناب حافظ صاحب قبلہ کا تذکرہ گرامی، محترم پرویز صاحب کی وساطت سے، طلوع اسلام کی سابقہ اشاعت میں زینت دہ اوراق ہو چکا ہے۔ جیسا کہ پرویز صاحب نے تحریر فرمایا تھا، قبلہ حافظ صاحب کی عمر قریب سو سال کی ہوگی۔ بینائی کا یہ عالم ہے کہ بمشکل حروف پڑھ سکتے ہیں۔ بایں ہمہ "اسباب زوال امت" کے سوال کی اہمیت کے پیش نظر قبلہ حافظ صاحب نے اپنے خیالات اس طرح زیب قرطاس فرمائے ہیں کہ جو کچھ وہ لکھ رہے تھے، اسے خود پڑھ نہیں سکتے تھے۔ یعنی بلا دیکھے اپنے خیالات تحریر فرماتے چلے گئے۔ اب یہ تحریر آپ نے طلوع اسلام کو بغرض اشاعت مرحمت فرمائی ہے۔ جس پر طلوع اسلام جس قدر بھی فخر کرے کم ہے۔ یہ طلوع اسلام کی خوش بختی ہے کہ جناب حافظ صاحب کی سابقہ تحریریں ۱۹۴۰ء-۴۱ میں بھی یہیں شائع ہوئیں اور ان کے بعد اب یہ تحریر بھی اسی کے حصہ میں آئی۔ و ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

طلوع اسلام

سوال یہ ہے کہ جب مسلمان حق پر ہیں تو ایسے بُرے حال میں کیوں ہیں۔ یہود و نصاریٰ سے بھی بدتر۔ یہاں تک کہ ہندوؤں سے بھی ہر چیز میں کہیں فروتر۔

(قبلہ حافظ صاحب کی کتاب دعوت الحق میں ایک طالب آپ سے سوالات پوچھتا ہے اور آپ اس کے جوابات دیتے ہیں۔ وہ اسلام کی حقانیت سے متاثر ہونے کے بعد مندرجہ بالا سوال پوچھتا ہے۔ یعنی حافظ صاحب، طلوع اسلام میں شائع شدہ سوال کو اسی طالب کے سوال کی آخری کڑی قرار

دیتے ہیں۔ (طلوع اسلام)

ہاں یہ اعتراض صحیح ہے اس کا جواب ذرا توجہ سے سنئے

خدا نے بندوں کا برا حال دیکھ کر پیغمبروں کے بھیجنے کا سلسلہ شروع کیا ہر قوم میں پیغمبر آئے۔ خدا کا پیغام لائے یعنی کتاب اللہ لائے۔ اسے قوم کو دیا۔ اور اس پر خود عمل کر کے انہیں بتایا۔ قوم نے ترقی کی۔ مختلف اقوام میں سے ہر ایک قوم کو اصول کے اعتبار سے ایک ہی کتاب مختلف زبانوں میں ملتی رہی تھی۔ ہر کتاب ایک دوسرے کی مصدق۔ کیونکہ ہر ایک کتاب قانون فطرت کے مطابق تھی۔

خدا کی شان سے یہ بہت بعید تھا کہ فطرت تو کچھ اور بناتا اور حکم کچھ اور دیتا۔ سب پیغمبروں کی کتابیں جب ان کی قومیں ضائع کرتی گئیں تو آخر میں ایک پیغمبر ساری دنیا کے لئے آیا۔ چونکہ اس کے بعد کسی اور پیغمبر کی ضرورت نہ تھی اس لئے رسالت کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔ اب اس کی ضرورت تھی کہ اس کتاب کو جو اللہ نے اس پر وحی کی تھی محفوظ رکھا جاتا اس کی حفاظت خدا نے اپنے ذمہ لی۔ چنانچہ دیکھ لو۔ وہ اب تک خدا کی حفاظت میں ہے۔ یہی اسلام اگلی کتابوں میں تھا۔ وان ھذا لفی زبر الاولین (شعراء)۔ یقیناً قرآن پہلی کتابوں میں بھی تھا" چنانچہ تمام کتب سابقہ ایک دوسرے کی مصدق تھیں اور وہ اب قرآن میں آگئیں اس لئے قرآن ان سب کا مصدق (محافظ) ٹھیرا۔ اس لئے ہمیں حکم دیا کہ سب پیغمبروں اور ان کی تمام کتابوں پر ایمان لاؤ۔ قرآن پر ایمان، ان سب پر ایمان کو اپنے اندر لے آتا ہے۔ خدا ایک۔ رسول سب برحق۔ کتابیں سب ایک دوسرے کی مصدق کیونکہ سب فطرت کے مطابق تھیں اور فطرت غیر متغیر ہے۔ لا تبدیل لخلق اللہ۔ اسی طرح لا تبدیل لکلمات اللہ

جس طرح ساری قوموں نے اول اول اصل کتاب اللہ پر عمل کیا اور اس سے دین اور دنیا کی کامیابی حاصل کی۔ رفتہ رفتہ دنیا کا خیال دین پر غالب آنے لگا تو انہوں نے کتاب اللہ کو ضائع کرنا شروع کر دیا اور اس کی جگہ بنائی ہوئی باتوں پر عمل پیرا ہو گئے۔ آہستہ آہستہ کتاب اللہ کی جگہ ان ہی باتوں نے لے لی۔ باتوں کو حدیثیں کہتے ہیں۔ تورات و انجیل کو اٹھا کر دیکھو۔ کہیں خدا کا قول نہیں ملے گا۔ ہر جگہ یہی ملے گا کہ رسول نے یہ کہا۔ نبی نے یہ فرمایا۔ یوں ان کی کتابیں ضائع ہو گئیں۔

مسلمانوں کا جب تک قرآن پر عمل رہا، کامیابی نے پرچم لہرایا۔ سلطنت نے عروج پکڑا۔ یہ عروج ایسا مکمل تھا کہ قرآن چھوڑنے کے بعد بھی ایک عرصہ تک اس کے اثرات باقی رہے۔ اس کے بعد سلطنت نے دین کو دنیا سے الگ کر دیا۔ دنیا کا خیال دین پر غالب آیا۔ اس کے لئے قرآن پیچھے ڈال دیا گیا اور جس طرح پچھلی امتوں نے حدیثیں بنائی تھیں، انہوں نے بھی یہی کچھ کرنا شروع کر دیا۔ اب جو جج اور قاضی مقرر ہوتے تھے ان کی تقرری کا معیار، حدیث دانی ہوتا تھا۔ اب عزت و تکریم قرآن جاننے والوں کے لئے نہیں بلکہ

حدیث جاننے والوں کے لیے تھی۔ موضوعی حدیثوں کا دروازہ کھل گیا۔ خدا نے حکم دیا تھا فاحکم بینھم بما انزل اللہ (جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے اس کے مطابق فیصلے کرو) اور فانما یسرنٰہ بلسانک لتبشر بہ المتقین وتنذر بہ قوماً لدّا (مریم) "سو ہم نے اس قرآن کو تیری زبان میں آسان کیا ہے تاکہ تو متقیوں کو اس کے ذریعے بشارت دے اور جھگڑالو قوم کو اس کے ذریعے ڈرائے"۔ یعنی فیصلے بھی ما انزل اللہ (قرآن) کے مطابق ہونے تھے اور تبشیر و تنذیر بھی اسی کے ذریعے۔ لیکن قوم نے کیا کیا۔ اسے بھی سنئے۔

خدا کا فرمان تھا کہ اے رسول ان سے کہدے کہ اوحی الی ھذا القراٰن لانذرکم بہ ومن بلغ (انعام) "یہ قرآن میری طرف وحی کیا گیا تھا تاکہ میں تمہیں بھی اس سے ڈراؤں اور اسے بھی جس تک یہ پہنچے"۔ یعنی جو کچھ خدا نے وحی کیا وہ سب قرآن میں تھا۔ قرآن سے باہر وحی کہیں نہ تھی۔ لیکن قوم نے کہا کہ یہ غلط ہے۔ ایک وحی جلی ہے جو قرآن میں ہے اور ایک وحی خفی ہے جو حدیث ہے۔ خدا نے قرآن کی تبلیغ کا حکم دیا لیکن قوم نے کہا کہ نہیں جبریل (معاذ اللہ) حضورؐ کے کان میں کہہ جاتے تھے کہ جو کچھ قرآن میں وحی کیا گیا ہے وہ غلط ہے۔ تم یوں حکم دو۔ مثلاً خدا نے وصیت کا حکم دیا" للوالدین والاقربین" جبریل نے کہا کہ یہ دکھلاوے کا حکم ہے۔ اصل حکم یہ ہے لا وصیۃ لوارث (وارث کے لئے کوئی حکم نہیں)۔ یعنی خدا نے وصیت کا حکم دیا۔ اس کی تاکید کی۔ اور جو وصیت نہ کر سکے اس کی طرف سے خود وصیت کر دی (وصیۃ من اللہ) لیکن آیت وصیت کو حدیث نے منسوخ کر دیا۔ اور آیت ترکہ کی آیت فرض کر کے ترکہ کی تقسیم شروع کر دی۔ اور حجب وغیرہ کا تصفیہ کھڑا کر دیا۔ اسی طرح قرآن نے کہا تھا کہ زنا کی سزا سو دُرّے ہیں۔ لیکن قوم نے حدیث گھڑی اور کہہ دیا کہ زنا کی سزا سنگسار ہے۔ حالانکہ سنگسار کا حکم قرآن میں کہیں بھی نہیں۔ یہ صریح قرآن کی تحریف اور رسول پر اتہام ہے۔ غرضیکہ کہاں تک لکھا جائے۔ قرآن کا کوئی حکم اور کوئی تبشیر و تنذیر نہیں جو حدیث سے متاثر نہ کر دی گئی ہو۔

وحی خفی کو فرض کر کے حدیثوں کو رسول اللہ کی طرف منسوب کیا اور اس طرح آپ کو متہم کر دیا۔ یہ پہلی بدعت تھی جو دین میں داخل کی گئی۔ اسی سے سب فرقے بنے۔ شیعہ، سنی، مقلد، غیر مقلد، شافعی، حنفی، مالکی، حنبلی۔ اور علیٰ ھذا اس قدر فرقے نکلنے شروع ہو گئے۔ یہ سب فرقے حدیث کی وجہ سے نکلے اور مسلمان مشرکوں میں داخل ہو گئے۔ کہ قرآن کا حکم ہے کہ

ولا تکونوا من المشرکین من الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعاً۔
کل حزب بما لدیھم فرحون۔

۔ دیکھنا تم مشرکین میں سے نہ ہو جانا۔ یعنی ان لوگوں میں سے جنہوں نے دین میں فرقے پیدا کر دیئے اور خود بھی ایک فرقہ بن کر بیٹھ گئے۔ چنانچہ پھر حالت یہ ہو گئی کہ ہر فرقہ اپنے

مسلک پر متفق ہو کر بیٹھ گیا۔

یوں آخری اسلام میں بھی پھوٹ پڑ گئی۔ اور پھوٹ خدا کا عذاب ہے۔ قل ھو القادر علیٰ ان یبعث علیکم عذاباً من فوقکم او من تحت ارجلکم او یلبسکم شیعاً و یذیق بعضکم بأس بعض (انعام) "خدا اس پر قادر ہے کہ تم پر تمہارے اوپر سے عذاب بھیجے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے۔ یا ایسا کرے کہ تم گروہ گروہ ہو کر آپس میں لڑ بھڑو اور ایک (گروہ) دوسرے (گروہ) کی شدت کا مزہ چکھے" مسلمانوں نے اس پھوٹ کا خوب مزہ چکھا ہے اور بغداد کی تباہی کے بعد یہ عذاب شدید ترین شکل میں ان پر مسلط ہو چکا ہے یہ ہے راز مسلمانوں کی تباہی کا۔ قرآن سے منہ موڑ کر اگر ذلیل نہ ہوتے تو اور کیا ہوتا۔ انہوں نے قرآن کو چھوڑا تو باقی رسومات رہ گئیں۔ انہوں نے کہا کہ رسومات کو محکم طور پر قائم رکھو۔ بس یہی مذہب ہے۔ فقط اتنا یاد رکھو کہ فلاں چیز سنت ہے۔ فلاں مکروہ ہے۔ فلاں واجب ہے۔ قرآن ان اصطلاحوں سے بے نیاز ہے۔ قرآن میں جس چیز کے کرنے کا حکم ہے وہ فرض ہے اور بس۔ قرآن اصطلاحات سکھانے اور رسومات کا پابند بنانے نہیں آیا تھا۔ وہ آیا تھا مسلمانوں میں جذبۂ جہاد بیدار کرنے کے لئے۔ قل ان کان آباؤکم و ابناؤکم ... قوم الفاسقین (توبہ) ان سے کہدو کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے خاندان کے لوگ اور مال جو تم کماتے ہو اور تجارت جس کے مندا پڑ جانے پر تم ڈرتے ہو اور مکان جن کو تم پسند کرتے ہو۔ تمہارے نزدیک اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے زیادہ محبوب ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم لے آئے۔ اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا۔ مسلمان جب تک قرآن کے پیچھے تھے، جہاد ان کے نزدیک سب سے بڑا فریضہ تھا۔ جب جہاد سے دل چرانے لگے تو پھر قرآن کے بجائے حدیثیں جمع کرنی شروع کر دیں جن میں ذرا ذرا سی بات پر ثواب کے پہاڑ مل جانے کی بشارتیں لکھ دی گئیں۔ خدا نے قرآن کے متعلق فرمایا تھا کہ فبذٰلک فلیفرحوا ھو خیر مما یجمعون "اسی قرآن سے زندگی کی شادمانیاں حاصل کرو۔ یہ ان چیزوں سے بہتر ہے جنہیں تم جمع کرتے پھرتے ہو" لوگوں نے اس کو یوں مذبوح کیا کہ قرآن ان خزانوں سے بہتر ہے جنہیں تم جمع کرتے ہو۔ لیکن تقابل ہمیشہ ہم جنس میں ہوتا ہے۔ اگر میں کہوں کہ چاند تارے میری کتاب سے بہتر ہیں تو یہ بات بے معنی ہوگی۔ لوگوں نے حدیثیں جمع کرنا شروع کر دی تھیں۔ اس کو خدا نے منع فرمایا۔ اور خدا کے رسول نے بھی منع فرمایا اور صاف کہدیا کہ لا تکتبوا عنی سوی القرآن و من کتب عنی شیئاً فلیمحہ۔ (مجھ سے قرآن کے سوا اور کچھ نہ لکھو۔ جس نے قرآن کے علاوہ مجھ سے کچھ اور لکھ لیا ہے اسے مٹا ڈالے) اسی کے اتباع میں خلیفہ اول نے لوگوں سے فرمایا کہ تم ان قوموں کو جانتے ہو جنہوں نے حدیثیں جمع کرنا شروع کر دیں اور کتاب اللہ کو ضائع کر دیا۔ دیکھو تورات اور انجیل اس پر شاہد ہیں۔ اسی کی تعمیل میں خلیفہ ثانی نے فرمایا کہ حسبنا کتاب اللہ (ہمارے لئے اللہ کی کتاب کافی ہے) اور حدیثیں بیان کرنے والوں کو

مجرم قرار دیا۔ اور جلا وطن اور نظر بند کر دیا۔ مگر آخر میں زمانہ بدل گیا۔ بادشاہوں کی سلطنت رنگ لائی۔ حدیث کو رسول کے نام کے ساتھ منسوب کر کے بدعت قائم کی اور اسے قرآن میں ضم کر دیا۔ بلکہ قرآن پر حکم قرار دیدیا۔ اب مولوی۔ شائخ۔ امام بننے شروع ہو گئے۔ حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی (رضی اللہ عنہم) میں سے نہ کوئی مولوی تھا نہ مولانا۔ نہ امام نہ کچھ اور وہ سب مومن تھے اور خدا کے بندے۔ خدا کا حکم تھا کہ اتبع ما اوحی الیک من ربک (اے رسول جو کچھ تم پر خدا کی طرف سے وحی کیا جاتا ہے اس کی اتباع کرو)۔ آپ نے کمال حقہ قرآن کی تعمیل فرمائی جس کی خود خدا نے شہادت دی۔ قل انما اتبع ما یوحی الی من ربی (ان سے کہدو کہ میں صرف اس کی اتباع کرتا ہوں جو مجھ پر میرے رب کی طرف سے وحی ہوتی ہے)۔ یعنی رسول اللہ نے منادی کر دی کہ میرا عمل قرآن کے سوا اور کسی چیز پر نہیں ہے اس سے واضح ہے کہ جس چیز کو قرآن نے فرض قرار دیا ہے وہی رسول اللہ کی سنت تھی۔ سنت اور فرض دو الگ الگ چیزیں نہیں۔ قرآنی فرائض کے علاوہ سنت اور کچھ نہیں کہ رسول نے قرآن ہی پر عمل کیا تھا اور عمل رسول کو سنت کہتے ہیں۔ اسی لئے قرآن نے کہدیا کہ من یطع الرسول فقد اطاع اللہ (یعنی چونکہ رسول قرآن پر عمل کرتا ہے اس لئے جس نے رسول کی اتباع کی اس نے خدا کی اطاعت کی)۔ بات بالکل صاف ہے قرآن سے باہر سنت کی تلاش کے یہ معنی ہیں کہ رسول اللہ (معاذ اللہ) زبان سے تو یہ کہتے تھے کہ میں صرف قرآن کی اتباع کرتا ہوں (انما اتبع ما یوحی الی من ربی) اور عملاً قرآن کے علاوہ کسی اور چیز کی بھی اتباع کرتے تھے جسے اب قرآن سے باہر سنت کہا جاتا ہے۔

ہمارا لکھنا آپ صاحبوں کو برا معلوم ہوگا۔ لیکن میں اب اگلی منزل سے بہت قریب ہوں اس لئے میں نے جو کچھ حق سمجھا اسے کھلے الفاظ میں کہدینا ضروری سمجھتا ہوں۔ آپ لوگوں نے قرآن کو چھوڑ دیا ہے اور خدا کو ایک دم بھول چکے ہو۔ میں یاد دلانا چاہتا ہوں کہ اللہ اللہ ہے اور لا یشرک فی حکمہ احدا (وہ اپنے حکم میں کسی اور کو شریک نہیں کیا کرتا)۔ آپ خدا کو کافی سمجھئے پھر دیکھئے کہ خدا آپ پر ویسا ہی مہربان ہو جائے گا جیسا پہلے تھا۔ اپنے بدعتی خیالات سے دین کو خالص کر دو الا للہ الدین الخالص (دین خالص صرف اللہ کے لئے ہے)۔ بس دین خالص ہیں (جو قرآن کے اندر ہے) مسلمانوں کی تمام فلاح و بہبود مضمر ہے۔ جب دین میں بدعت کی آمیزش ہو جائے وہ دین خالص نہیں رہا کرتا۔ اور ملے جلے دین کا نتیجہ (جسے خدا شرک قرار دیتا ہے) ذلت و رسوائی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ جب تک جی چاہے اسے آزما لو۔ یہ اللہ کا قانون ہے جو نہ پہلی امتوں کے لئے بدلا ہے نہ تمہارے لئے بدلے گا۔ مسلمانو! ایک مرتبہ پھر کہو کہ

حسبی اللہ۔ نعم المولیٰ و نعم النصیر

میرے لئے اللہ کافی ہے۔ وہی بہترین آقا ہے اور وہی بہترین مددگار۔

پھر اس کے بعد دیکھو کہ اس کی ولایت اور نصرت کفایت کرتی ہے یا نہیں۔ والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ۔

باب المراسلات

تعدد ازدواج | ایک صاحب دریافت فرماتے ہیں کہ ایک شخص کی بیوی موجود ہے بچے موجود ہیں گھر میں امن چین سے رہتے ہیں یکایک انہیں سوجھتی ہے تو کسی نوجوان لڑکی سے شادی کر لیتے ہیں۔ سارا گھر جہنم بن جاتا ہے۔ جب پوچھئے تو کہتے ہیں کہ جب شریعت نے چار تک کی اجازت دی ہے تو اس پر اعتراض کرنے والا کون ہے۔ چونکہ اس میں "شریعت کی اجازت" کا بھی سوال آجاتا ہے اسی لئے شاید وہ لوگ جو شریعت کے زیادہ پابند ہوتے ہیں، دو تین چار بیویاں وعلاوہ عشر گھر میں لے آتے ہیں۔ کیا اسلام نے واقعی اس کو یوں کھلا چھوڑ دیا ہے کہ جس کا جی چاہے بیویاں کرتا چلا جائے۔

طلوع اسلام - تعدد ازدواج کا رواج مسلمانوں میں اس خصوصیت سے چلا آرہا ہے کہ اسے اسلام کے مسلمات میں سے سمجھ لیا گیا ہے۔ مخالفین اس پر اعتراض کرتے ہیں تو، اور مسلمان اس کی مدافعت کرتے ہیں تو، دونوں صورتوں میں اسے ایک مسلّمہ سمجھ لیا جاتا ہے جس پر غور کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی جاتی۔

قرآن کریم میں صرف ایک مقام پر ایک سے زیادہ بیوی کا ذکر آتا ہے اور وہ ہے سورۂ نساء کی تیسری آیت۔ اس سورہ کی دوسری آیت یہ ہے۔ وَاٰتُوا الْیَتٰمٰٓی اَمْوَالَھُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِیْثَ بِالطَّیِّبِ وَلَا تَاْکُلُوْٓا اَمْوَالَھُمْ اِلٰٓی اَمْوَالِکُمْ اِنَّہٗ کَانَ حُوْبًا کَبِیْرًا ﴿۲﴾ "اور یتیموں کو ان کے مال دیدو اور اچھی چیز کو ردی سے نہ بدلو۔ اور ان کے مالوں کو اپنے مال کے ساتھ ملا کر مت کھاؤ۔ کیونکہ یہ بڑا گناہ ہے۔" یہ ہے ان یتیموں کے بارے میں حکم جو صاحب مال وجائداد ہوں۔ ان کے متعلق فرمایا کہ ان کے اموال کو بطور امانت رکھو اور ان میں تصرف بیجا نہ کرو۔

اب دوسری صورت یہ ہے کہ قوم میں ایسی حالت پیدا ہو جائے کہ بہت سے یتیم رہ جائیں۔ مثلاً جنگ میں مرد ضائع ہو جائیں یا وبا وغیرہ میں۔ ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ بیوہ عورتیں اور ان کے ساتھ یتیم بچے رہ جائیں تو قوم کے سامنے ان کی حفاظت اور پرورش کا سوال بہت اہمیت رکھے گا۔ ایسی حالت میں جو قوم ان بیواؤں اور یتیموں کا مناسب انتظام نہیں کر دیتی، اپنے نظام معیشت اور معاشرت میں ایسی خرابیوں کی ذمہ دار بن جاتی ہے جن سے تمام معاشرہ میں فساد ہی فساد رونما ہو جانے کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔

اگر نوجوان بیوہ عورتوں کو بلا سرپرستی کے چھوڑ دیا جائے تو اس سے بہت سی خرابیوں کے جراثیم پھیل جانے کا احتمال ہو جاتا ہے۔ اگر یتیم بچوں کی کفالت کا مناسب انتظام نہ کیا جائے تو وہ یا تو بھکاری بن جائیں گے یا عادی جرائم پیشہ۔ جب کسی قوم میں بعض ہنگامی حوادث کی وجہ سے ایسے حالات پیدا ہو جائیں تو اس صورت حالات کا کیا علاج کیا جائے۔ قرآن نے اس کے متعلق فرمایا ہے کہ وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ...... (۴/۳) "اور اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم یتیموں کے بارے میں انصاف نہ کر سکو گے تو ان عورتوں سے جو تمہیں پسند ہوں نکاح کر لو۔ دو، تین، چار تک۔"

سارے قرآن مجید میں یہی ایک آیت ہے جس میں تعدد ازدواج کا ذکر ہے۔ اب ظاہر ہے کہ یہ اجازت غیر مشروط و غیر مقید نہیں بلکہ اس آیت کی ابتداء ہی ایک شرط سے ہوتی ہے۔ یعنی وان خفتم (اگر تمہیں اندیشہ ہو) الا تقسطوا فی الیتٰمی (کہ یتیموں کے بارے میں انصاف نہ کر سکو گے) تو تمہیں اس امر کی اجازت ہے کہ ایک بیوی کی موجودگی میں، چار کی حد تک اور بیویاں کر لو۔ اور اس طرح معاشرہ کو ان تمام خرابیوں سے بچا لو جو ان بیوگان کو بلا سرپرست، اور ان کے یتیم بچوں کو بلا وارث چھوڑنے سے پیدا ہو جاتی تھیں۔ ان سے نکاح کر لینے کی شکل میں یہ بیوگان خاندان کے اندر محفوظ ہو گئیں اور ان کے بچے، بمنزلہ تمہاری اولاد کے ہو گئے۔ اب وہ اپنے آپ کو "یتیم خانہ" کی غیرت کش فضا میں نہیں بلکہ اپنے باپ کے گھر میں خیال کریں گے۔ اس باپ کے گھر میں جس کے ترکہ سے وراثت میں سے بھی حقدار ہوں گے۔ قرآن نے اس مصیبت کا یہ حل تجویز کیا ہے۔

چونکہ یہ ایک فوری مسئلہ کا حل ہے اس لئے ظاہر ہے کہ اس امر کا فیصلہ بھی قوم ہی کر سکتی ہے کہ اس قسم کے ہنگامی حالات پیدا ہو گئے ہیں یا نہیں جن میں ایک مرد کی کفالت میں ایک سے زیادہ عورتیں دے دینے کی ضرورت لاحق ہو گئی ہے۔ اگر معاشرتی نظام سمجھ لے کہ ایسا وقت آ گیا ہے تو وہ اس قسم کا قانون نافذ کر دے گا اور اس وقت ایک ہنگامی ضرورت کے پیش نظر تعدد ازدواج جائز ہو جائے گی۔ جب وہ ہنگامی ضرورت ختم ہو جائے گی تو پھر سے عام حالات عود کر آئیں گے جن میں اصولی طور پر ایک ہی بیوی کی اجازت ہوگی۔

ان ہنگامی حالات میں بھی ہر شخص کو اجازت نہیں ہوگی کہ وہ ایک سے زیادہ بیویاں اپنے نکاح میں لے آئے۔ یہ اجازت صرف اسے دی جائے گی جو اس کا اہل ہوگا کہ سب بیویوں کی ضروریات زندگی کا منصفانہ بوجھ اٹھا سکے۔ چنانچہ آیت مندرجہ صدر کا اگلا ٹکڑا ہے۔ فان خفتم الا تعدلوا فواحدۃ (۴/۳) "اور اگر تمہیں ڈر ہو کہ انصاف نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی بیوی رہے گی۔" اب سوال یہ ہے کہ اس حق سے مقدم کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ بیوی سے نکاح کا تعلق جذبات سے ہے اور یہ مشکل ہے کہ انسان جذبات کی تقسیم"

بھی مساویانہ کر سکے۔

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے، اور بجھائے نہ بنے

چنانچہ خلاقِ فطرت نے خود اس کی شہادت دی ہے کہ وَلَنْ تَسْتَطِيعُوا أَنْ تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَاءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ (۴/۱۲۹) "تم اپنی طرف سے کتنے ہی خواہشمند کیوں نہ ہو۔ یہ بات تمہاری طاقت سے باہر ہے کہ عورتوں میں (ہر معاملہ میں) عدل کر سکو"

اب یہاں ایک الجھاؤ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن نے ہنگامی حالات میں ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت اس شرط کے ساتھ دی ہے کہ تم ان میں عدل کر سکو تو یہ عجیب بات ہوئی۔ اس کے تو یہ معنی ہوئے کہ ایک طرف تو اجازت دی اور دوسری طرف اس اجازت کو ایک ناممکن شرط سے مشروط کر دیا۔ بھلا اس اجازت سے فائدہ کیا جو ناممکن العمل ہو؟

لیکن قرآن نے اسے خود ہی واضح کر دیا ہے کہ جس عدل سے تعددِ ازواج مشروط ہے اس عدل سے مفہوم کیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ یہ تو تمہارے بس کی بات نہیں کہ تم قلبی لگاؤ میں بھی میزان کے دونوں پلڑے برابر رکھ سکو۔ اس لئے تم سے جس عدل کا تقاضا ہے وہ یہ ہے کہ فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ (۴/۱۲۹) "پس ایسا نہ کرو کہ ایک طرف ایسا جھک جاؤ کہ دوسری "معلقہ" بن کر رہ جائے۔" "معلقہ" اس عورت کو کہتے ہیں کہ جو نہ تو بیوہ یا مطلقہ ہو کہ اپنا ٹھکانا کہیں اور کر سکے اور نہ ہی اس کا خاوند اس کا حق ادا کرے۔ اور اس طرح بیچ بیچ میں لٹکی رہے۔ یعنی جن امور پر تم قدرت رکھتے ہو ان میں سب کے ساتھ مساویانہ سلوک کرو۔ اور اگر تمہیں ڈر ہو کہ تمہارا طبعی میلان تمہیں اس مساویانہ سلوک پر قائم نہ رکھ سکے گا تو پھر ایک سے زیادہ بیوی کو اپنے نکاح میں مت لاؤ۔

یہ ہیں تعددِ ازدواج سے متعلقہ قرآنی احکام۔ ان سے واضح ہے کہ

(۱) اسلام میں تعددِ ازدواج اصولِ معاشرت نہیں بلکہ ایک استثنا ہے۔

(۲) یہ استثنا ایسے ہنگامی حالات کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے ہے جن میں عورتوں اور لاوارث یتیموں کی تعداد بڑھ جائے۔ اور وہ عام معاشرہ کے لئے ایک مشکل بن جائے۔

(۳) ایسے حالات میں، اسلامی نظام فیصلہ کرے گا کہ ان لوگوں کو جو ایک سے زیادہ خاندانوں کی کفالت کی استطاعت رکھتے ہوں، ایک سے زیادہ بیویوں سے نکاح کرنے کی اجازت دے دی جائے تاکہ معاشرہ کا یہ مشکل مسئلہ حل ہو سکے۔

(۴) یہ اجازت بھی اس شرط سے مشروط ہوگی کہ (قلبی میلان کے علاوہ) وہ تمام بیویوں سے مساویانہ

سلوک کر سکنے کا اہل ہو۔

(۵) اس صورت میں اس ہنگامی قومی مسئلہ کا حل ہو جائے گا۔

یہ ہے قرآن کی رو سے ایک سے زیادہ بیویاں کرنے کی اجازت اور وہ مسلمانوں کا عمل۔ اب آپ خود سوچئے کہ ان کے اس عمل کو جس کی رو سے عمر کا جی چاہے دھڑا دھڑ بیویاں کرتا چلا جائے، قرآنی اجازت سے کیا نسبت ہے؟ ظاہر ہے کہ قرآنی اجازت کو اپنی ہوس رانیوں کی تسکین کے لئے ایک مقدس بہانہ بنا لیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ چار کے بعد سب سے بڑی (یعنی پہلی) بیوی کو طلاق دیکر الگ کر دیا جاتا ہے اور اس کی (Vacancy) میں ایک اور دوشیزہ بھرتی کر لی جاتی ہے۔ اور یہ تو محض "بیویوں" کا تذکرہ ہے۔ "لونڈیوں" پر تو تعداد کی بھی کوئی قید نہیں۔ ایک ایک محل سے ہزاروں کے قافلے برآمد ہو جاتے ہیں۔ اور تماشا یہ کہ انہیں بھی عین شریعت حقہ کے مطابق قرار دیا جاتا ہے۔ یہ ہے ہمارے دور ملوکیت کی وہ خود ساختہ شریعت جس نے ہمیں کسی کے سامنے منہ دکھانے کے قابل نہیں رکھا اور جسے غیرت سے بیگانے مدعیان شریعت "اب بھی دنیا میں رائج کرنے کے متمنی ہیں۔ (تفصیل اس کی طلوع اسلام کی کسی سابقہ اشاعت میں گزر چکی ہے جس میں غلاموں اور لونڈیوں کے بارے میں بحث ہوئی تھی)

بہر حال اتنی بات تو بالکل واضح ہے کہ قرآن میں ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت صرف سورۂ نساء کی تیسری آیت میں ہے اور اس آیت کی ابتدا ان الفاظ سے ہوئی ہے کہ وان خفتم الا تقسطوا فی الیتمٰی (اگر تمہیں خوف ہو کہ یتیموں کے بارے میں انصاف نہ کر سکو گے ۔۔۔ تو ایک سے زیادہ بیوی کی اجازت ہے)۔ جو شخص ایک بیوی کی موجودگی میں اور شادی کرلے اس سے ذرا پوچھئے کہ اس نے اس شرط کو پورا کر لیا ہے۔ اور پھر ساتھ ہی ذرا جائزہ لیجئے ان "مقدس حرم سراؤں" کا جن میں ہر سال یوں بیویاں بدلتی رہتی ہیں جیسے نئے سال کا کیلنڈر۔ اور پھر سوچئے کہ انہوں نے اپنی کامجوئیوں کے لئے کس طرح "مذہب" کو آڑ بنا رکھا ہے!

حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

❀

۴۔ تلاوت قرآن پاک

ایک اور صاحب دریافت فرماتے ہیں کہ ہمارے ہاں اکثریت ان لوگوں کی ہے جو قرآن کریم کے الفاظ پڑھتے ہیں لیکن ان کے معنی بالکل نہیں سمجھتے۔ کیا اس سے کچھ فائدہ بھی ہے؟

طلوع اسلام　　طلوع اسلام میں اس سے بیشتر اس موضوع پر لکھا جا چکا ہے لیکن سوال کی اہمیت کے پیش نظر اس کی تکرار بھی فائدہ سے خالی نہیں ہوگی۔

ہم پوچھنے صرف اس قدر ہیں کہ کیا دنیا میں کوئی اور کتاب بھی ایسی ہے جسے آپ بلا سمجھے پڑھتے رہیں۔ کسی ایسی زبان میں لکھی ہوئی کتاب تو ایک طرف رہی جسے آپ جانتے ہی نہ ہوں، اگر کتاب کی زبان آپ جانتے ہوں لیکن وہ کتاب آپ کی استعداد سے زیادہ مشکل ہو، تو بھی آپ اسے نہیں پڑھیں گے۔ کہ جب کچھ پلے ہی نہیں پڑتا تو پھر اسے پڑھا کس لئے جائے۔

جب کیفیت یہ ہے تو پھر قرآن کو اس سے کیوں مستثنیٰ رکھا جاتا ہے؟ کتاب پڑھنے سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ آپ اس کتاب کے مضامین (contents) کو سمجھ سکیں۔ اگر آپ اس کے معانی کو نہیں سمجھ سکتے تو اس کتاب کا پڑھنا آپ کو کیا فائدہ دے گا؟ یہ ایک عام سمجھ کی بات ہے۔ پھر معلوم نہیں کہ "مذہب" کے معاملہ میں سمجھ کو کیوں الگ رکھ دیا جاتا ہے۔ قرآن ایک کتاب ہے اور اس میں یہ لکھا ہے کہ تمہیں دنیا میں زندگی کس طرح گزارنی چاہیئے۔ اب ظاہر ہے کہ اس کتاب کو پڑھا اس لئے جائے گا کہ سمجھا جائے اور سمجھا اس لئے جائے گا کہ اس کے بتائے ہوئے طریق کے مطابق زندگی بسر کی جائے۔ کہئے! کیا اس کے الفاظ کو دہرا لینے سے یہ مقصد حاصل ہو جائے گا؟ قرآن اپنے آپ کو "کتاب مبین" (ایک واضح کتاب) کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میری زبان "عربی مبین" (صاف و سلیس عربی زبان) ہے۔ وہ اپنے آپ کو "ہدایت" (راہ نمائی) اور "نور" (روشنی) بتاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس میں قوموں کے عروج و زوال کے بین اصول منضبط ہیں۔ وہ بتاتا ہے کہ اس میں ارتقاء شرف انسانیت کے قوانین و آئین مندرج ہیں۔ وہ اپنے مضامین پر بار بار دعوت غور و فکر دیتا ہے۔ وہ ہر صاحب فکر و نظر کو اس میں تدبر و تفکر کے لئے تاکید کرتا ہے۔ وہ اس میں تدبر نہ کرنے والوں کو سطح انسانیت سے گرا ہوا قرار دیتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو عقل کی آنکھ کے لئے سورج کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ ہم پوچھتے یہ ہیں کہ کیا قرآن کا یہ مقصود بلا سوچے سمجھے پڑھنے سے حاصل ہو سکتا ہے! ہم کہتے ہیں کہ قرآن پر اس سے بڑا ظلم اور کیا ہے کہ اسے بلا سمجھے پڑھا جائے۔ آپ کسی مصنف سے یہ کہئے کہ میں تمہاری کتاب کے ایک لفظ کو بھی نہیں سمجھتا لیکن اس کے باوجود ہر روز اسے پڑھتا ہوں حتیٰ کہ مجھے وہ زبان بھی نہیں آتی جس میں تم نے کتاب لکھی ہے اس کے باوجود اس کے الفاظ کو دہراتا رہتا ہوں۔ آپ خود ہی سوچئے کہ وہ مصنف آپ کو کیا جواب دے گا؟ حقیقت یہ ہے کہ اُمت کو قرآن سے دور لے جانے کا سب سے مؤثر حربہ یہ تھا کہ ان کے دل میں اس خیال کو راسخ کر دیا جائے کہ قرآن کو بلا سمجھے پڑھنے سے بھی "ثواب" حاصل ہوتا ہے۔ یہ ان سازشوں میں سے بڑی سازش تھی جو دنیا میں اس عظیم المرتبت قوم کو اس کے مقام سے گرانے کے لئے سوچی گئیں (ہم جانتے ہیں کہ وہ مسلمان جن کی زبان عربی ہے، یا جو عربی جانتے ہیں) وہ بھی دوسروں کے ساتھ ہی ذلیل ہیں۔ لیکن اس کے لئے اور وجوہات ہیں) جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں، یہ عقیدہ کہ بلا سمجھے قرآن کے الفاظ دہرانے سے "ثواب"

ہوتا ہے، یکسر غیر قرآنی عقیدہ ہے۔ یہ عقیدہ درحقیقت "عہدِ سحر (Magic Age) کی یادگار ہے۔ جب یہ سمجھا جاتا تھا کہ الفاظ اپنے اندر تاثیر رکھتے ہیں (معانی نہیں بلکہ تاثیر) یہ قرآنی اعمال، تعویذ، نقوش وغیرہ، اوراد وظائف، سب اسی عقیدہ کی مستعار شکلیں ہیں۔ قوم ہزار برس سے ان تعریحات میں الجھی چلی آرہی ہے اور ان سے نجات کی اب بھی کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی۔ اس لئے کہ قوم کو جہالت کی ان وادیوں میں گھیرے رکھنے سے ایک طبقہ کی روزی وابستہ ہے اس لئے وہ اسے ظلمات سے نور کی طرف آنے ہی نہیں دیتا۔ جب کوئی اللہ کا بندہ اس کے خلاف آواز اٹھاتا ہے تو یہ طبقہ اس کی ہر قسم کی مخالفت کرتا ہے اور وہ اس آواز کو "مذہب اور سلف صالحین کے طریقہ" کے خلاف قرار دے کر عوام کے جذبات کو مشتعل کر دیتا ہے۔ یہی سب مترفین (دوسروں کی کمائی پر زندگی بسر کرنے والوں) کا وہ گروہ ہے جو ہمیشہ حق کی آواز کے خلاف محاذ قائم کرتا رہا ہے اور آج بھی یہی کچھ کر رہا ہے۔ اس لئے کہ انہیں معلوم ہے کہ قرآن (حضرت) موسیٰؑ کا وہ اژدھا ہے جو ان ساحرین کی نگاہ فریب رسیوں کو صاف نگل جائے گا۔ اس لئے وہ قرآن کو قوم کے سامنے کبھی بے نقاب نہیں ہونے دیں گے۔ اور اس کے بجائے وہ ان پڑھوں کو قرآنی الفاظ کے دہرانے کے "ثواب" اور لکھے پڑھوں کو اسرائیلی روایات پر مشتمل تفاسیر کے حقائق کے فریب میں مبتلا رکھیں گے۔ تاکہ

ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں

۳۔ صدقہ و خیرات

دریافت کیا گیا ہے کہ جس طرح ہم آج کل خیرات کے پیسے بانٹتے ہیں اس سے کچھ فائدہ بھی ہے۔

طلوعِ اسلام۔ قرآن میں یہودیوں کے متعلق ہے کہ وہ پہلے اپنے اعزہ و اقربا کو غیروں کی اسیری میں دے دیتے تھے اور پھر ان کی طرف سے فدیہ ادا کر کے اسارت سے چھڑا لیتے اور اسے بہت بڑا کارِ خیر سمجھ کر اپنی نجات کا ذریعہ قرار دیتے۔

بعینہٖ یہ حالت مسلمان سرمایہ داروں کی ہے۔ یہ لوگ دوسروں کا خون چوس کر خود امیر بنتے اور انہیں غریب و محتاج بنا دیتے ہیں اور پھر عید و شب برات پر ان کی طرف خیرات کے چند پیسے پھینک کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ اس کارِ ثواب سے ان کی عاقبت سنور جائے گی۔ یعنی جس طرح ہماری متصوفانہ شاعری میں گناہ کو اس لئے ضروری سمجھا جاتا ہے کہ اگر گنہگار نہ رہیں گے تو خدا کی صفت "غفور رحیم" کا مظاہرہ کس طرح سے ہو گا۔ اسی طرح قوم میں غریبوں اور محتاجوں کی موجودگی کو ضروری قرار دیا جاتا ہے کہ اگر غریب نہ رہیں گے تو پھر خیرات کے احکام کی تعمیل کس طرح سے ہو گی؟ غور کیجئے۔ نظامِ سرمایہ داری کے جراثیم کا اثر کس قدر دور رس ہوتا ہے۔

اسلام جس نظام کو نافذ کرنا چاہتا ہے اس میں ہر شخص کی ضروریاتِ زندگی کی کفالت حکومت کے

ذمہ ہوتی ہے۔ لہٰذا اس نظام میں محتاجوں کی جماعت کا مستقل وجود تصور میں بھی نہیں آسکتا۔ البتہ بعض انفرادی اور مقامی صورتیں ایسی پیدا ہو سکتی ہیں کہ ان میں فوری امداد کی ضرورت پڑ جائے۔ یا بعض ہنگامی حوادث ایسے رونما ہو سکتے ہیں جن میں خود حکومت کو اس قسم کی ضرورت لاحق ہو جائے اور وہ ٹیکس عائد کرنے کے بجائے رضاکارانہ طور پر کوئی فنڈ اکٹھا کرنے کی اپیل کرے۔ لیکن اس قسم کے واقعات شاذ ہوں گے۔ عام حالت یہی ہوگی کہ ملک میں حکومت کا انتظام محتاجوں کی خود کفالت کرے گا۔ لہٰذا اسلام میں عام خیرات (Charity) کی ضرورت یا تو ایسے عبوری دور میں پڑے گی جب آپ کا نظام ہنوز بروئے کار نہ آیا ہو یا بعض مقامی اور ہنگامی حوادث کے لئے غریبوں اور محتاجوں کی جماعت کا مستقل وجود اور پھر ان کی طرف خیرات کے سکّے پھینک کر اسے اپنے لئے "ثواب" کا کام تصور کرنا، اسلامی نظام میں بار نہیں پا سکتا۔ یہ سرمایہ داری نظام کا فریب نگاہ ہے جسے مذہبی تقدس کے خوش آیند غلاف میں چھپایا جا رہا ہے۔ اور اس کا نتیجہ وہی "حبطت اعمالهم" کی تفسیر یعنی اس تمام صدقہ وخیرات کے باوجود قوم میں محتاجوں اور غریبوں کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور تعداد کے علاوہ غربت اور احتیاج کی شدت بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ اور یہ سب اس سرمایہ دارانہ نظام کی بدولت ہے جو ہمارے ہاں ہر جگہ رائج ہے اور جسے بدلنے کے لئے کوئی تیار نہیں۔ اس لئے کہتے ہیں کہ انسان کا خون نمکین ہوتا ہے اور نمکین خون منہ سے لگا ہوا کبھی نہیں چھوٹتا۔ اس قارونیت کے استیصال کے لئے مصلح عظیم کی ضرورت ہوتی ہے اور وہی آج سے نہیں!

رفتارِ عالم

کشمیر سال نو کے آغاز سے کشمیر میں التوائے جنگ سے جو خوشگوار توقعات پیدا ہوئی تھیں، وہ مرورِ وقت کے ساتھ موہوم تر ثابت ہوتی جا رہی ہیں۔ اقوامِ متحدہ کا بھیجا ہوا کمیشن جس طریقہ سے اس عقدہ کے حل کی کوشش کر رہا ہے، اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ مسئلہ کو عمداً الجھایا جا رہا ہے۔ اس کے حل میں جتنی تاخیر واقع ہو رہی ہے اسی قدر ہندوستان کا رویہ غیر معقول ہوتا جا رہا ہے۔ بلکہ ہندوستان کا غیر معقول رویہ اس میں تاخیر پیدا کر رہا ہے۔ ۲۸ اپریل کو کمیشن نے ہندوستان و پاکستان کی حکومتوں کو جو "آخری" تجاویز بھیجی تھیں، ان کے متعلق ۲۰ جون کو سرکاری طور پر اعلان کیا گیا کہ دونوں حکومتوں نے ان تجاویز کو منظور نہیں کیا۔ اعلان کے مطابق فوجوں کی ترتیب اور واپسی کے بارے میں جو اختلاف پایا جاتا ہے وہ کم نہیں ہو سکا۔ کمیشن نے وعدہ کیا کہ "وہ دونوں حکومتوں کے جوابات کا تفصیلی مطالعہ کر رہا ہے اور تمام متعلقہ امور پر غور کرنے کے بعد آئندہ کے پروگرام کا فیصلہ کیا جائے گا۔" ان جوابات کو شائع نہیں کیا گیا۔

اپریل میں دونوں حکومتوں کو دعوت دی گئی کہ وہ کشمیر میں التوائے جنگ کی حدیں قائم کرنے کے لئے کراچی میں ایک مشترکہ کانفرنس میں شرکت کریں۔ دعوت میں یہ تصریح کی گئی تھی کہ اس کانفرنس میں صرف فوجی امور پر بحث کی جائے گی۔ اور سیاسی امور زیرِ بحث نہیں آئیں گے۔ اس کانفرنس کی جولائی میں کئی نشستیں منعقد ہوئیں اور بالآخر پاکستان اور ہندوستان نے باہمی سرحدات کے تعین پر اتفاق کر لیا ہے جو عاجلانہ التوائے جنگ کے باعث غیر متعین رہ گئی تھیں۔ یہ فیصلہ ۲۷ جولائی کو ہوا۔ اور دونوں حکومتیں چار دن کے اندر اندر اس کی توثیق کر دیں گی۔ اس فیصلہ پر قریباً سات مہینے صرف ہو گئے ہیں اور کئی بار تو ایسا نظر آنے لگتا تھا کہ یہ بیل منڈھے نہیں چڑھے گی۔

قارئین کو یاد ہو گا کہ کشمیر کمیشن ۱۳ اگست ۱۹۴۸ء اور ۵ جنوری ۱۹۴۹ء کی قراردادیں تین تدریجی حصوں پر مشتمل تھیں۔ پہلا حصہ التوائے جنگ اور التوائے جنگ سے متعلقہ حدود کے تعین سے متعلق تھا۔ سات مہینوں میں صرف اسی حصہ پر عمل کرنے پر اتفاق ہو سکا ہے۔ دوسرا حصہ متارکہ کا ہے، اور تیسرا استصواب کا۔ ان پر قدرے تفصیلی تبصرہ فروری ۱۹۴۹ء کی اشاعت میں کیا جا چکا ہے۔

ادھر کمیشن اور مذاکرات باہمی کی یہ آہستہ خرامی ہے ادھر ہندوستان آئے دن ایسی حرکتیں کر رہا ہے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مسئلہ کشمیر کا حل طے شدہ اصول۔ استصواب رائے سے نہیں کرنا چاہتا بلکہ وہ تقسیم کشمیر کو ایک مسلمہ حقیقت سمجھتا ہے۔ ۲۲ مئی کو پنڈت نہرو دہرہ دون میں کہہ چکے تھے کہ جب تک کشمیر سے حملہ آور چلے نہیں جائیں گے، رائے شماری نہیں ہوگی۔ ۲۰ مئی کو پنڈت صاحب نے سری نگر میں پھر کہا۔

کشمیر ہندوستان کا ایک حصہ ہے اور دنیا کی کوئی طاقت کشمیر کو ہندوستان سے جدا نہیں کر سکتی۔

انہوں نے غیر مبہم الفاظ میں کہہ دیا کہ۔ ہندوستان کسی حالت میں بھی کشمیر کو نہیں چھوڑے گا۔ اس کی تائید کرتے ہوئے نہرو کے کفش بردار عبداللہ نے کہا

کشمیر ہمیشہ ہندوستان کے ساتھ رہے گا، خواہ اس اتحاد کی کتنی ہی قیمت کیوں نہ دینی پڑے۔

الحاق کی قیمت

گویا نہ ہندوستان کشمیر کو چھوڑے گا نہ کشمیر ہندوستان کو۔ عبداللہ ہندوستان کے ساتھ الحاق کی کتنی بڑی قیمت دے رہا ہے اس کا اندازہ اس ہیجان و اضطراب سے لگایا جا سکتا ہے جس کی گرفت میں مقبوضہ کشمیر آچکا ہے۔ کشمیر کی تجارت کے قدرتی راستے بند پڑے ہیں کیونکہ یہ سب راستے پاکستان سے گزرتے ہیں۔ اشیائے خوردنی کی قلت نے عبداللہ حکومت کے لئے خاصی مشکل پیدا کر رکھی ہے مقبوضہ علاقہ میں قحط اپنی پوری ہولناکیوں کے ساتھ شروع ہو چکا ہے اور اس کے ساتھ ہی عبداللّٰہی انتقام کی شمشیر بھی بے نیام ہو چکی ہے۔ گیہوں ساٹھ روپے من کے حساب سے بھی بمشکل دستیاب ہوتا ہے۔ ہندوستان خود غلے کی قلت کا شکار ہے۔ وہ اس قابل نہیں کہ مقبوضہ کشمیر کی غذائی مشکل کو حل کر سکے۔ بھوک نے عبداللہ حکومت کو اس حد تک غیر مقبول کر دیا ہے کہ پاکستان کے حق میں کھلم کھلا مظاہرے ہو رہے ہیں۔ ان کی پاداش میں کشمیری عوام و خواص کو گوناگوں مظالم کا تختۂ مشق بنایا جا رہا ہے۔ ہندوستانی علاقہ سے مظلوم و مفلوک الحال کشمیریوں کے مزید جیش آزاد کشمیر اور پاکستان میں پہنچ رہے ہیں۔ مہاراجہ کشمیر "خرابی صحت" کے پیش نظر ریاست سے باہر جانے کا فیصلہ کر چکا ہے۔ اس کی جگہ اس کا بیٹا کمار سنگھ "اختیارات" سنبھالے گا۔

۱۹ جون کو وزیر اعظم پاکستان نے تراڑ کھل (آزاد کشمیر) میں آزاد کشمیر افواج کے ایک اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے یہ انکشاف کیا کہ اس وقت مقبوضہ کشمیر میں جو سخت قحط ہے اس کو دور کرنے کے لئے حکومت پاکستان نے مفت اناج مہیا کرنے کی پیشکش کی ہے۔ پاکستان نے یہ پیشکش خالص انسانی ہمدردی کے جذبہ سے متاثر ہو کر کی تھی لیکن ہندوستان نے اسے ٹھکرا دیا ہے۔ کمیشن نے یہ عجیب و غریب عذر پیش کر کے

اس سلسلہ میں پاکستان کو سہولتیں مہیا کرنے سے انکار کر دیا ہے کہ یہ مسئلہ اس کے حیطۂ اختیارات میں شامل نہیں۔ قرارداد کمل کی اسی تقریر میں محترم لیاقت علی خان نے اس حقیقت کا ایک بار پھر اعلان کیا کہ مسئلہ کشمیر کے حل کا دنیا کے امن سے بہت گہرا تعلق ہے۔ دنیا کے اسی امن کی خاطر برطانوی دولت مشترکہ بھارت کی امداد کرنے پر آمادہ ہو گئی اور خود پاکستان نے اپنی دفاعی ضرورتوں کو قربان کر کے اس امداد میں شریک ہونے پر رضامندی کا اظہار کیا۔ لیکن مسئلہ کشمیر کے متعلق دولت مشترکہ نے اپنی مجہول (Passive) — بلکہ جانبدارانہ روش کو بدلنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

تقسیم کشمیر اور ہندوستان

ہندوستان تقسیم کشمیر کو کس طرح ایک مسلمہ حقیقت سمجھتا ہے، ۱۷ مئی کو اس کا ایک اور مظاہرہ کیا گیا ہے اس روز ہندوستان کی مجلس دستور ساز میں ایک تحریک پیش کی گئی جس کے مطابق مہاراجہ کشمیر کو یہ حق دیا گیا کہ وہ مجلس دستور ساز میں ریاست کے چار نمائندے نامزد کرے۔ حسرت موہانی اور پروفیسر کے۔ ٹی شاہ نے پنڈت نہرو کو کشمیر کی رائے شماری کے متعلق اپنے وعدے یاد دلانے کی بہت کوشش کی۔ پروفیسر شاہ نے مشورہ دیا کہ کشمیر کی رائے شماری تک یہ نمائندگی عارضی رکھی جائے لیکن اس کے جواب میں سرکاری طور پر یہ کہا گیا

اکتوبر ۱۹۴۷ء میں کشمیر کا الحاق ہندوستان جائز، مکمل اور غیر مشروط ہو چکا ہے۔

چنانچہ یہ تحریک پاس ہو گئی۔ حالانکہ اس وقت بہ تکرار اعلان کیا گیا تھا کہ یہ الحاق عارضی ہے اور حالات پرسکون ہوتے ہی اس سوال کا فیصلہ جمہور کی آزادانہ رائے سے کیا جائے گا۔ اس تضاد کے باوجود کمیشن ہندوستان کے پاس خاطر کا اس قدر اہتمام کر رہا ہے۔ حکومت پاکستان نے ہندوستان کی اس حرکت کے خلاف کمیشن سے احتجاج کیا ہے کہ اس نے مقبوضہ کشمیر کے چار نمائندے ہندوستانی دستور میں شامل کر کے استصواب کے سمجھوتے کی خلاف ورزی کی ہے۔ اس فیصلہ سے لازمی طور پر رائے شماری کے فیصلہ پر برا اثر پڑے گا۔ لیکن ہندوستان نے اس احتجاج کی کوئی پرواہ نہیں کی اور مقبوضہ کشمیر کے چار نمائندے "دستور" میں شامل کر لئے گئے ہیں۔ ہندوستان استصواب کے امکانات کم سے کم کرنے کی کوشش ہی نہیں کر رہا۔ بلکہ وہ ایک قدم اور آگے جا رہا ہے۔ وہ ایسے انتظامات کر رہا ہے کہ اگر کسی وقت استصواب ہو بھی جائے تو اس کی حیثیت ایک مذاق سے زیادہ نہ ہو۔ مقبوضہ علاقے سے مسلمانوں کو اس لالچ پر مشرقی پنجاب لا کر "آباد" کیا جا رہا ہے کہ اس جگہ انہیں معاش کی زیادہ سہولتیں میسر ہوں گی۔ اور ان کی جگہ غیر مسلموں کو لا بسایا جا رہا ہے۔

ہندوستانی دستور میں شیخ عبداللہ کے نمائندوں کی شمولیت پر پاکستان احتجاج کر رہا تھا اور پاکستان کے بعض حلقوں کی طرف سے یہ مطالبہ کیا جا رہا تھا کہ پاکستان آزاد کشمیر حکومت کو تسلیم کر لے اور پاکستان مجلس دستور ساز میں آزاد کشمیر کے چار نمائندے لئے جائیں۔ خود آزاد کشمیر حکومت کے صدر سردار ابراہیم نے بھی

مطالبہ کیا، کیونکہ ان کے الفاظ میں: "ہندوستان کے رد کردہ فیصلے کا دلیرانہ جواب یہی ہو سکتا ہے۔" گویا جس اصول پر ہندوستان کے اقدام پر پاکستان معترض ہوا ہے اس کی وہ خود خلاف ورزی کرے۔ اور اس طرح وہ بھی عملاً کشمیر کی تقسیم کو تسلیم کر لے!

ہندوستان کے داخلی مسائل

ہندوستان ایک طرف عقدۂ کشمیر کو اپنی خواہشات کے مطابق حل کرانے کی تگ و دو میں ہے اور دوسری طرف وہ ایک وسیع اندرونی خلفشار سے دوچار ہے۔ بنگال، بمبئی، مدراس اور حیدرآباد میں کمیونسٹوں کی کارروائیاں روز افزوں ہیں۔ حیدرآباد کے بعض علاقوں میں کمیونسٹوں کی متوازی حکومت قائم ہے۔ بنگال ابھی تک ہنگامہ زار بنا ہوا ہے۔ کلکتہ میں کمیونسٹوں اور پولیس میں کئی ایک تصادم ہو چکے ہیں۔ ایک غیر ملکی اطلاع کے مطابق صوبائی حکومت امن و امان کی بحالی میں بالکل ناکام رہی ہے۔

پچھلے دنوں مغربی بنگال میں کانگرس کے وقار کو ایک زبردست دھکا لگا۔ ایک ضمنی انتخاب میں شرت چندر بوس نے کانگرس کے امیدوار کو تیرہ ہزار ووٹ کی اکثریت سے پچھاڑ دیا۔ مسٹر بوس سوشلسٹ ریپبلک پارٹی کے بانی اور صدر اور ہندوستان کی موجودہ حکومت کے شدید ترین مخالفین میں سے ہیں۔ اس انتخاب کے دوران میں کئی ایک سخت ہنگامے ہوئے۔ ۱۵ رجون کو جس روز اس ضمنی انتخاب کا اعلان ہوا، نئی دہلی میں کانگرس اسمبلی پارٹی کے ایک اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے پنڈت نہرو نے کہا کہ کلکتہ کے انتخاب کو عوام کا فیصلہ نہیں کہا جا سکتا۔ تاہم ہمیں عوام کے ساتھ زیادہ رابطہ قائم کر کے ان میں شعور پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ ۱۹ رجون کو ایک تقریب کا افتتاح کرتے ہوئے نہرو نے نہایت افسوس سے کہا

"مجھے سب سے زیادہ تکلیف اس چیز سے ہوئی ہے کہ ہمارا اخلاقی معیار بہت گر گیا ہے"

انہوں نے یہ بھی کہا کہ مشکلات کو کم سمجھنا حماقت ہے۔ اسی روز ہندوستان کی سوشلسٹ پارٹی کے صدر جے پرکاش نرائن نے پٹنہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا۔

> ہمیں آج اتنی شہری آزادی بھی حاصل نہیں جتنی انگریزوں کے زمانہ میں تھی۔۔۔ کانگرس حکومت کے سامنے دو راستے ہیں۔۔۔ بدامنی اور طوائف الملوکی کی راہ، کمیونزم یا سوشلزم۔ کانگرس حکومت آزادی سلب کر کے بدامنی کی آگ کو خود ہوا دے رہی ہے۔

۱۳ رجولائی کو پنڈت نہرو کلکتہ گئے۔ ان کا استقبال "واپس جاؤ" کے نعروں، بموں کے دھماکوں اور خشت باری سے کیا گیا۔ لکھنؤ کے ہوائی اڈہ پر بھی بم پایا گیا۔

مسلم آزاری کی مہم

ان داخلی مشکلات کے باوجود ہندوستان میں مسلم آزاری کی مہم سرد نہیں پڑی۔ وہاں کی مسلم اقلیت کو بدستور گوناگوں مصائب کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ گذشتہ ماہ کئی ایک مقامات پر فرقہ وارانہ فسادات ہوئے جن میں اتلاف جانی، مالی کی

تفصیل کبھی معلوم نہیں ہو سکے گی۔ اس کے علاوہ حکومت ہندوستان نے ہر اس مسلمان کی جائداد کو متروکہ جائداد قرار دے دیا ہے جو عارضی طور پر بھی گھر سے غیر حاضر ہے۔ لیکن اپنے صوبے کے بجائے کسی دوسرے ہندوستانی صوبے میں رہ رہا ہے۔ حکومت ہندوستان کا یہ ہنگامی قانون جنوری ۱۹۴۹ء کے معاہدہ کراچی کی صریح خلاف ورزی ہے اس معاہدے کے مطابق متروکہ جائدادوں کے متعلق علاقوں کا تعین کر دیا گیا تھا۔ ہندوستان کے تازہ اقدام کا نتیجہ بچے کھچے مسلمانوں کی خستہ حالی کے سوا کچھ نہ ہو گا تاکہ وہ تنگ آکر پاکستان کے لئے مزید بوجھ بن جائیں۔ پاکستان نے بالآخر یہ محسوس کر لیا ہے کہ اس آرڈیننس کے جواب کی ضرورت ہے، چنانچہ گورنر جنرل پاکستان کے ایک تازہ آرڈیننس کی رو سے پاکستان میں متروکہ جائداد کی خرید و فروخت ممنوع قرار دے دی گئی ہے۔ اس آرڈیننس کو مغربی پاکستان میں دو ماہ کے لئے نافذ کر دیا گیا ہے۔

۲۷ جون کو کراچی میں دونوں مملکتوں کے نمائندوں کی ایک کانفرنس اس غرض کے لئے منعقد کی گئی تھی کہ متروکہ جائدادوں کی فروخت و تبادلے کے متعلق مزید کارروائی کی جائے۔ لیکن پاکستان نے اصرار کیا کہ اس سلسلہ میں مزید کارروائی کرنے سے پیشتر مجولہ ہنگامی قانون کو منسوخ کر دیا جائے۔ ہندوستان نے اس تنسیخ کو ناممکن العمل بتایا جس پر یہ کانفرنس بے نتیجہ ختم ہو گئی تھی۔ مسلمانوں کو دہشت زدہ کرنے کے لئے حکومت ہندوستان نے راشٹریہ سیوک سنگھ کو برائے نام قانونی پابندی سے آزاد کر دیا ہے۔ سنگھ کے ایک راہنما نے اس اقدام پر یہ تبصرہ کیا ہے جو مسٹر پٹیل سنگھ کی کرتے رہے ہیں۔ سنگھ کے گرو گول والکر نے کہا کہ اب سنگھ اور چمکیگا! اس نے یہ بھی کہا ہے کہ اس نے حکومت ہند کو کسی قسم کی زبانی یا تحریری ضمانت نہیں دی جیسا کہ حکومت کا خیال ہے۔

پاکستان میں تفرقہ کی لعنت

پاکستان بھی اندرونی خلفشار کا کم شکار نہیں دونوں کے کوائف میں فرق صرف اسی قدر ہے کہ احزاب انتشار اپنے ملک کے حکومتی نظام کو ملک کی معاشی و تعلیمی مسائل کا ذمہ دار سمجھتے ہوئے اسے الٹ دینے کا کھلم کھلا اعلان کر رہے ہیں، لیکن پاکستان کے انتشار پسند عناصر ملکی مسائل سے کلی طور پر بے پروا ہو کر صرف ہوس اقتدار کی تسکین میں مصروف ہیں۔ یہ انتشار مسلم لیگ کی خصوصی سیاست کا شرمندہ تخلیق ہے۔ اس پر مفصل تبصرہ اسی اشاعت میں کیا جا رہا ہے لہٰذا اس تذکرہ کو یہاں نظر انداز کیا جاتا ہے۔ البتہ اس ضمن میں یہ قابل ذکر ہے کہ۔۔

وزیر اعظم پاکستان کی طرف سے مغربی پنجاب مسلم لیگ کی بے جا ناز برداری کے خلاف احتجاج کے طور پر گورنر موڈی مستعفی ہو گئے ہیں۔ میاں عبد الباری کراچی میں مشیروں کے تقرر کے سلسلہ میں سرکاری و غیر سرکاری ملاقاتوں میں مصروف تھے کہ ۱۰ر جولائی کو کراچی سے اعلان ہوا کہ گورنر کا استعفیٰ منظور کر لیا گیا ہے۔ مشیروں کے تقرر کا معاملہ نئے گورنر کے تقرر کے لئے تک التوا رکھا گیا تھا۔ حسب توقع نیا گورنر پاکستانی مقرر ہوا ہے۔ اس عہدہ کے لئے مرکزی حکومت کے وزیر مواصلات سردار عبد الرب نشتر کا انتخاب کیا گیا ہے۔ امید ہے وہ ۲ر اگست کو

اپنے عہدے کا چارج سنبھالیں گے۔ اس سے پہلے صوبہ سرحد میں انگریز گورنر سر امبروس ڈونڈاس کی جگہ ایک پاکستانی، صاحبزادہ کرنل خورشید کا تقرر کیا جا چکا ہے۔ جنہوں نے ۱۶ جولائی کا چارج لے لیا ہے۔

۲۷ جون کو پاکستانی پنجاب کے پہلے وزیر اعظم، افتخار حسین خان ممدوٹ، کے گورنر نے خیانت، بے ایمانی اور سرکاری دستاویزات کو تلف کرنے کے بارے میں بارہ جرائم کی فہرست دی اور لاہور ہائی کورٹ کو لکھا کہ ان جرائم کی تحقیقات کی جائے۔ چند روز کی کارروائی کے بعد ہائی کورٹ نے تحقیقات اکتوبر تک ملتوی کر دی ہے۔

پاکستان میں غیر پاکستانی افسر

پاکستان میں اب اس تاخیر پر بجا خدشات کا اظہار کیا جا رہا ہے جو ملک کی کلیدی اسامیوں پر صرف پاکستانیوں کو فائز کرنے کے سلسلہ میں روا رکھی جا رہی ہے۔ ۳۰ جون کو حکومت پاکستان کے ایک سرکاری اعلان میں بتایا گیا کہ فروری ۱۹۴۸ء میں پاکستانی فوج کو "پاکستانی" بنانے کے سلسلہ میں جو کمیٹی مقرر کی گئی تھی اس کی سفارشات مان لی گئی ہیں۔ ان سفارشات کے مطابق ۱۹۵۲ء کے اواخر تک پاکستانی فوج کو پاکستانی بنا دیا جائے گا۔ قیام پاکستان کے بعد بھی لیاقت علی خان نے اعلان کیا تھا کہ پاکستانی بنانے کا عمل تین سال تک مکمل کر دیا جائے گا۔ لیکن موجودہ رفتار سے کوئی خوش آئند توقعات وابستہ نہیں کی جا سکتیں۔

افغانستان دشمنان پاکستان کی صف میں

گزشتہ مارچ میں افغانستان نے پاکستان کے خلاف پروپیگنڈے کی جس مہم کا آغاز کیا تھا اس کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے، کابل ریڈیو اور افغانستان کے واحد دو اخبارات نشر دروغ میں پاکستان کے دوسرے ہمسایہ "ہندوستان" سے بھی دو قدم آگے جا رہے ہیں۔ ۲۰ جون کو رسوائے عالم فقیر ایپی کے آدمیوں اور افغانستان کے سرحدی دستے کے سپاہیوں نے پاکستان کے ایک ہوائی جہاز پر بلاوجہ گولیاں چلائیں جن سے جہاز کو کچھ نقصان بھی پہنچا۔ جہاز نے جواب میں اس اجتماع پر گولہ باری کی۔ اس واقعہ کے بعد افغانستان اور اس کے ساتھ ہی ہندوستان سے یہ پروپیگنڈا شروع کیا گیا کہ پاکستانی ہوائی جہاز نے افغانی علاقہ پر بم باری کی ہے جس سے نقصان جان بھی ہوا ہے۔ اس مفروضہ بم باری کے خلاف افغانستان میں ایک عجیب طوفان بدتمیزی مچایا گیا۔ اس طوفان کا عکس دیکھنا ہو تو سرکاری اخبار "اصلاح" کا اقتباس ذیل ملاحظہ کیا جائے جو ۲۰ جون کے پرچے میں شائع ہوا۔

> پاکستان پہلے بھی ہماری تلوار کی ضرب کا مزہ چکھ چکا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم ایک بار پھر اسے یہ مزہ چکھائیں...... ثقافتی طور پر ہم افغان مزید پسماندہ رہے لیکن میدان جنگ میں ہم دوسروں سے بہت آگے ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی شاندار روایات کو برقرار رکھیں...... اور نا تحسین کی ہے قوم (افغان) اپنی آزادی کے دشمنوں پر تلوار کے وار کرے۔

اس تعلی اور نشر دروغ کے ساتھ بیرونی استمداد کی شر انگیز تجویز پیش کی جانے لگی۔ ابتدائے جون میں امریکہ کے

"نیویارک ٹائمز" کی ایک اطلاع کے مطابق افغانستان کے وزیر خارجہ نے کہا

> افغانستان کے آزاد قبائل کے علاقہ کا مسئلہ ثالثی کے لئے برطانیہ کے سامنے رکھے گا اور اگر برطانیہ نے کوئی فیصلہ نہ کیا تو اسے ادارہ اقوام متحدہ میں پیش کیا جائے گا۔ اور اگر وہاں بھی خاطر خواہ فیصلہ نہ ہو سکا تو ممکن ہے نوبت جنگ تک آجائے۔

امریکہ و برطانیہ کی ثالثی کے خطرناک نتائج کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ تاہم افغانستان نے بالآخر برطانیہ سے افغانستان و پاکستان کے "تنازع" میں امداد کی اپیل کی۔ پاکستان نے اسے اپنے داخلی معاملات میں بلاوجہ مداخلت سے تعبیر کرتے ہوئے اس کے خلاف احتجاج کیا۔

۳ر جولائی کو پتہ چلا کہ پاکستان کا بدخواہ فقیر ایپی افغانستان چلا گیا ہے جہاں اس کا سرکاری طور پر خیر مقدم کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس قسم کی خبریں آنا شروع ہوئیں کہ افغان حکام ایپی کو پختونستان کا بادشاہ بنانے کا اعلان کرنا چاہتے ہیں۔ پاکستان نے افغانستان کی اس غیر دوستانہ۔ بلکہ معاندانہ حرکت کے خلاف احتجاج کیا۔ لیکن افغانستان دوسروں کے کھونٹے پر ایسا ناچ رہا ہے کہ وہ پاکستان کے لئے مشکلات پیدا کرنے کے ساتھ اپنی راہ میں بھی کانٹے بونے سے اجتناب نہیں کرتا۔ افغانستان میں مقیم پاکستانی باشندوں کو بلا وجہ تنگ اور گرفتار کیا جا رہا ہے۔

ایران و عراق نے دونوں ملکوں سے اپیل کی تھی کہ وہ اپنے جھگڑے کا تصفیہ پر امن طریقے سے کر لیں۔ پاکستان نے اس کا مناسب جواب یہ دیا ہے کہ اب تک یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ افغانستان کو ہمارے خلاف شکایات کیا ہیں۔ افغانستان کے برسر اقتدار خاندان کا رویہ روز بروز زیادہ سے زیادہ غیر معقول ہوتا جا رہا ہے۔ ڈیورنڈ لائن کے متعلق افغان نیشنل اسمبلی کے صدر نے اعلان کیا کہ وہ اسے تسلیم نہیں کرتے کیونکہ یہ حد بندی انگریزوں کے زمانہ میں کی گئی تھی اور انگریز اب جا چکے ہیں۔ ۲۰ر جون کو "اصلاح" نے احساس کمتری کا ایک عجیب مظاہرہ یوں کیا۔

> پاکستان کو معلوم ہونا چاہیئے کہ ہم اس وقت بین الاقوامی معاہدات کو جو پاس کر رہے ہیں، جب اس کی حد ہو گئی اور جب ہم نے اپنے جبری اور جوش سے ابلتے ہوئے باشندوں کو اپنی حفاظت اور جوابی حملے کے لئے حکم دیا تو پاکستان کو بہت مشکل پیش آئے گی۔ جس قوم کی آزادی کی جڑیں ابھی مضبوط نہیں ہو سکیں وہ بہت جلد ایسے گڑھے میں گر جائے گی جہاں سے وہ کبھی اٹھ نہیں سکے گی۔

افغانستان نے پاکستانی ہوائی جہاز کی بمباری کے متعلق جو ہنگامہ برپا کر رکھا ہے اس کے متعلق پاکستان نے یہ تجویز پیش کی کہ اس واقعہ کی مشترکہ تحقیقات کی جائے۔ کچھ عرصہ تک افغانستان اسے ٹالتا رہا۔ ۲۱ر جون کو چند غیر ملکی

سفیروں کو وہ مقام دکھایا گیا جس کے متعلق یہ الزام ہے کہ وہاں پاکستانی طیارہ نے بم گرائے تھے۔ یہ کارروائی یکطرفہ تھی۔ بالآخر افغانستان نے مشترکہ تحقیقات کی تجویز کو منظور کر لیا۔ پاکستان کا وفد افغانستان جا چکا ہے۔

۳۰ جون کو برطانوی پارلیمان میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے تعلقات دولت مشترکہ کے وزیر نوئل بیکر نے کہا۔

بین الاقوامی قانون کی رو سے قبائلی علاقوں میں پاکستان پرانی حکومت ہند اور حکومت برطانیہ کے حقوق و فرائض کا جائز وارث ہے۔

لیکن جب ان سے واضح جواب طلب کیا گیا کہ اس بین الاقوامی قانون کے احترام اور دولت مشترکہ کے وجود کو حق بجانب ثابت کرنے کی خاطر بروقت ضرورت برطانیہ پاکستان کی امداد کرنے لگا یا نہیں تو حکومت برطانیہ کا ترجمان آئیں بائیں شائیں کر کے خاموش ہو گیا۔

مسلم دنیا

اپنے مسلم ہمسایہ کے ہاتھوں یہ چرکے لگائے جا رہے ہیں اور پاکستان مسلم ممالک کے ساتھ باضابطہ دوستانہ معاہدوں پر دستخط کرنے کے لئے بے تاب ہے۔ اس مقصد کے لئے پاکستان نے عرب لیگ کے اندر اور باہر کی حکومتوں کو ایک کانفرنس میں شمولیت کی دعوت دی ہے جو سرما میں کراچی میں منعقد کی جا رہی ہے۔ مسلم ممالک میں باہمی کشیدگی بڑھتی جا رہی ہے۔ عراق اور شام، شام اور شرق اردن، مصر اور شام کے باہمی تعلقات بہت کشیدہ ہو چکے ہیں۔ عراق کی طرف سے مردہ عرب لیگ کے سکرٹری جنرل عزام پاشا کی برطرفی کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ ۲۶ جون کو حسنی زعیم سات سال کے لئے شام کا بلا مقابلہ صدر منتخب ہو گیا۔

ممالک عربیہ کی اس باہمی کشمکش سے مسئلہ فلسطین کھٹائی میں پڑ گیا ہے اور یہودی اپنی حیثیت کو مضبوط سے مضبوط تر کر رہے ہیں۔ ان کے توسیعی عزائم کی یہ کیفیت ہے کہ ۷ جون کو اسرائیلی فوجیں یروشلم کے جنوب میں اقوام متحدہ کے غیر جانبدار علاقہ میں داخل ہو گئیں اور اقوام متحدہ کے فلسطینی مصالحتی کمیشن کی جائے قیام پر قبضہ کر لیا۔ ایک سرکاری اعلان کے مطابق مصالحتی کمیشن کا عملہ اسرائیلی فوج کی اس حرکت پر بہت مضطرب ہوا۔ کچھ روز بعد یہ فوج واپس کر لی گئی لیکن اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسرائیل اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے کسی بین الاقوامی ضابطے کے پابند نہیں۔

مشرق وسطیٰ اس وقت دول عظمیٰ کی ہوس اقتدار کا شکار ہے۔ برطانوی وزارت خارجہ کے سر ولیم سٹرینگ ان ہی دنوں ایران جا رہے ہیں۔ ان کی واپسی پر لندن میں مشرق وسطیٰ میں برطانوی سفیروں کی ایک کانفرنس ہو گی۔ عبدالالٰہ اور سائرنائیکا کے امیر سنوسی اس وقت انگلستان میں موجود ہیں۔ اس کے بعد شرق اردن کے شاہ عبداللہ ایران جائیں گے۔ امید ہے کہ صدر ترکیہ عصمت انونو بھی جائیں گے۔ ایران کے اخبارات لکھ رہے ہیں

بالآخر وقت لگے اس سرگرم سلسلہ سے مقصد یہ ہے کہ امریکہ و برطانیہ کے زیرسایہ جنوبی ایشیائی یونین یا مشرقی ممالک کی یونین بنائی جائے۔ جس میں ایران، ترکی، عراق، شام، شرق اردن، پاکستان، ہندوستان اور افغانستان شامل ہوں۔ لندن میں اس یقین کا اظہار کیا جا رہا ہے کہ افغانستان، ایران، عراق اور ترکی کو کمیونسٹ یلغار سے محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔

پاکستان اور روس

امریکہ و برطانیہ کی اس دوڑ دھوپ، بالخصوص ایران و افغانستان میں فوجی اڈوں کی پیش بندی سے روس غافل نہیں ہے۔ روس نے اس سلسلہ میں ایک اہم قدم اٹھایا ہے۔ ۱۰ رجون کو پاکستان کے وزیر خارجہ نے انکشاف کیا کہ جب لیاقت علی خاں لندن سے واپسی پر ایران میں فروکش تھے تو روس نے اپنے سفیر مقیم ایران کی وساطت سے ان کو ماسکو آنے کی دعوت دی تھی اور اس دعوت کو وزیر اعظم پاکستان نے قبول کر لیا ہے۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ اس سے پیشتر صدر ٹرومین پنڈت نہرو کو امریکہ آنے کی دعوت دے چکے ہیں۔ اور یہ دعوت انہوں نے قبول کر لی ہے۔

اب تک پاکستان نے برطانوی دولت مشترکہ سے جس طرح پر اپنے آپ کو چپکائے رکھا ہے اس کے پیش نظر پاکستان میں اس خبر کا گرم جوشانہ خیر مقدم کیا گیا۔ پاکستانی محسوس کرتے رہے ہیں کہ ہمیں اپنے دوستوں کے حلقے کو بلا وجہ محدود نہیں کرنا چاہیئے۔ اس خبر کی اشاعت پر بعض حلقوں میں شدید بے چینی کا اظہار کیا جانے لگا۔ چنانچہ اس کے ساتھ ہی اس قسم کا پروپیگنڈا شروع ہو گیا کہ روس میں مسلمانوں کے ساتھ سخت بدسلوکی کی جا رہی ہے۔ لطیفے کی بات یہ ہے کہ سب سے زیادہ پروپیگنڈا ہندوستان سے کیا گیا جہاں اب تک مسلمانوں کی عظیم اقلیت کی جان و مال و آبرو محفوظ نہیں۔ اقوام متحدہ کے ایک ذیلی کمیشن میں ہندوستانی نمائندہ مسٹر ایم آر مسانی نے روس کے خلاف اس الزام کو دہرایا جس کے جواب میں روسی نمائندہ کو کہنا پڑا کہ یہ بیان جھوٹ کا مرکب اور تہمت طرازی کی مہم ہے۔

امریکی و برطانوی خبر رساں ایجنسیوں نے اس قسم کی خبریں بھی دینا شروع کیں کہ لیاقت علی خاں کے مجوزہ دورۂ ماسکو کے خلاف مشرق وسطیٰ کے ممالک نے احتجاج کیا ہے۔ کراچی میں مقیم ترکی، ایران، عراق اور سعودی عرب کے سفراء کو ان خبروں کی پرزور تردید کرنی پڑی۔

بارہ اشخاص پر مشتمل روس کا ایک اقتصادی مشن پاکستان آ چکا ہے۔ لیاقت علی خاں کی روانگی ماسکو کی تاریخ کا اعلان ابھی تک نہیں ہوا۔ ممکن ہے وہ اکتوبر میں روانہ ہوں جب کہ نہرو امریکہ کے سفر پر جائیں گے۔ امریکہ و ہندوستان کی تعلقات کی استواری کے سلسلہ میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ امریکہ میں گاندھی کی یادگار قائم کرنے کے لئے ایک مسودہ قانون پیش کیا جا رہا ہے۔ وزیر خارجہ مسٹر ایچیسن کے الفاظ میں یہ یادگار "امن کے اس بڑے علمبردار کی موزوں یادگار ہو گی جس نے بلا شبہ تاریخ پر گہرا اثر ڈالا ہے"

سائرانیکا کی "آزادی"

لیبیا کی وحدت کو توڑنے اور طرابلیٹینیا کو اطالوی تولیت میں منتقل کر دینے کی جو تجویز ادارہ اقوام متحدہ میں عارضی طور پر ناکام ہوئی تھی اس کے سلسلہ میں یکم جون کو ایک اہم واقعہ رونما ہوا۔ اس روز وہاں کے امیر سید الادریس سنوسی کی قیادت میں لیبیا کے برطانوی سیادت کے حصہ سائرانیکا میں "آزادی" کا اعلان کیا گیا۔ حکومت برطانیہ نے جس سرعت سے اس "آزاد" حکومت کو تسلیم کیا اس سے یہ معلوم کرنا مشکل نہیں کہ اس کی حیثیت کیا ہے۔ امیر سنوسی کو اس نئی حکومت کا سردار تسلیم کیا گیا ہے۔ اس حکومت کے ماتحت صرف اندرونی امور ہوں گے جس کے اوپر برطانوی فوجی انتظام ہوگا۔ سائرانیکا کے بین الاقوامی معاہدات اور تعلقات کی ذمہ داری بھی برطانیہ پر ہوگی۔ امیر سنوسی اب اپنے اختیارات حکومت کے تعین کے لئے حکومت برطانیہ سے گفت وشنید (یا مرفت خنیدا) کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں وہ انگلستان پہنچ چکے ہیں۔

عرب لیگ کے سیکریٹری عزام پاشا کے الفاظ میں یہ "سامراجی منصوبوں کی تکمیل کا ذریعہ ہے" وہ انہوں نے اس خدشہ کا بھی اظہار کیا کہ اسی قسم کی کارروائی اٹلی طرابلیٹینیا میں اور فرانس فیضان میں کرے گا۔ اور اس طرح جو کچھ اقوام متحدہ میں نہیں ہو سکا اسے یوں پورا کیا جائے گا۔ لیبیا کی وحدت کو توڑنے کی طرف یہ پہلا قدم ہے۔ اگر لیبیا کو اس طرح "آزاد" حکومتوں کے ذریعے تین حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تو ہو سکتا ہے کہ اور دعویدار بھی پیدا ہو جائیں اور اس طرح لیبیا تین سے زیادہ حصوں میں تقسیم ہو جائے۔ لیبیا کی وحدت یقیناً پارہ پارہ ہو جائے گی اور اہالیان لیبیا کا مطالبہ آزادی و وحدت غیر موثر ہو کر رہ جائے گا اور یہی استعماری ذہن کا منشا و مقصود ہے۔ اس سے جہاں شمالی افریقہ کا ساحل امریکہ و برطانیہ کے لئے مخصوص ہو جائے گا وہاں اٹلی کو بھی اس احسان کا بدلہ دیا جا سکے گا جو اس نے معاہدہ اوقیانوس میں شامل ہو کر کیا۔ شمالی افریقہ کے عربوں کی تحاریک آزادی کو ناکام کرنے کی یہ بہترین صورت ہے۔

انڈونیشی جمہوریہ کی بحالی

۸ مئی کو ولندیزی اور انڈونیشی نمائندوں میں جوگجکرتا میں جمہوری حکومت کی بحالی اور آزاد انڈونیشی وفاق کے قیام کے سلسلہ میں ہیگ میں فریقین کی گول میز کانفرنس کے انعقاد کے سلسلہ میں جو سمجھوتہ ہوا تھا اس کے مطابق ۶ جولائی کو انڈونیشی جمہوریہ کے صدر ڈاکٹر سکارنو اور جمہوریہ کے دوسرے ارکان سمیت جوگجکرتا میں داخل ہوئے جہاں عوام کی طرف سے ان کا گرم جوشانہ خیر مقدم کیا گیا۔ جمہوریہ کے ان قائدین کو ولندیزیوں نے گذشتہ چھ ماہ سے جزیرہ بنکا میں نظر بند رکھا ہوا تھا۔ سکارنو نے خیر مقدم کرنے والے ہجوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا

> انڈونیشی عوام کی جہد مسلسل، ان کے اتحاد اور بین الاقوامی رائے کے دباؤ سے جمہوری حکومت بحال ہوئی ہے۔

اب اگلا قدم ہیگ میں گول میز کانفرنس کا انعقاد ہے۔ اس موقع پر یہ ذکر موجب دلچسپی ہوگا کہ ۱۵ اگست میں جمہوریہ کو قائم ہوئے چار سال ہو جائیں گے۔ جمہوریہ کے قیام کا اعلان ۱۷ اگست ۱۹۴۵ء کو کیا گیا تھا۔

چین | چین میں ۲۵ مئی کو کمیونسٹ فوجوں نے ایشیا کے سب سے بڑے شہر اور دنیا کے چوتھے بڑے شہر شنگھائی پر بغیر کسی مزاحمت کے قبضہ کر لیا تھا۔ نیشنلسٹ حکومت کینٹن چلی گئی ہے جو جنوبی چین میں واقع ہے۔ کچھ روز سے نیشنلسٹوں کی مزاحمت سخت اور کمیونسٹوں کی پیش قدمی مدھم پڑ گئی ہے۔ ۳۰ جون کو چینی کمیونسٹ پارٹی کی بیسویں سالگرہ پر تقریر نشر کرتے ہوئے پارٹی کے لیڈر (اور صدر) ماؤزے تنگ نے کہا۔

یہ خیال کرنا غلطی ہے کہ ہم بیرونی امداد کے بغیر فتح حاصل کر سکیں گے۔

اس کے کچھ روز بعد ۳ جولائی کو امریکی وزیر خارجہ ایچیسن نے یہ انکشاف کیا کہ امریکہ نیشنلسٹ چین کو وہ تمام مالی امداد دے رہا ہے جو اب وہ موثر طریق پر دے سکتا ہے۔

چین میں شکست کھا کر مارشل چیانگ کائی شک نے اپنے لئے اور شغلہ ڈھونڈ لیا ہے۔ ان دنوں وہ کمیونزم کے خلاف ایشیا میں محاذ قائم کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں انہوں نے پہلی ملاقات فلپائن کے صدر سے کی۔ جنوبی کوریا، جہاں سے حال ہی میں امریکی فوجیں واپس آئی ہیں، اور جس پر شمالی کوریا کے کمیونسٹوں نے حملے شروع کر دیئے ہیں، یہ جنوبی کوریا بھی اس محاذ میں شریک ہوگا۔

ویٹ نام | یکم جولائی کو سابق شاہنشاہ باؤ دائی ویٹ نام کا امیر حکومت اور وزیر اعظم بنا۔ اس روز نئی مملکت کی پہلی حکومت کے ارکان کا اعلان کر دیا گیا۔ اس نئی مملکت میں انام، ٹانکن اور کوچین چائنا شامل ہیں۔ باؤ دائی اور فرانس میں باؤ دائی کی واپسی کے متعلق ۸ مارچ ۱۹۴۸ء کو معاہدہ ہوا تھا۔ تحریک حریت ویٹ منھ کی رفتار میں کوئی سستی پیدا نہیں ہوئی۔

* * *

فردوس گمگشتہ

جناب پرویز کے اُن مضامین کا مجموعہ

جنھوں نے ہزاروں نوجوانوں کے دلوں سے شکوک و شبہات کے کانٹے نکال کر انہیں وہ اطمینان عطا کر دیا جو صرف یقین اور بصیرت ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ آنے والا مورخ جب ہمارے زمانے کی تاریخ لکھے گا تو وہ اس انقلاب کا صحیح اندازہ لگا سکے گا جو جناب پرویز کے حقیقت نگار قلم نے دلوں کی بستیوں میں پیدا کر دیا ہے۔ یہ تمام مضامین ایک خوشنما مجموعہ کی شکل میں اشاعت کے لئے پریس میں جا چکے ہیں۔ کتاب قریباً چار سو صفحات پر مشتمل ہوگی۔ کتاب کی مانگ اس قدر زیادہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ دیر میں طلب کرنے پر مل نہ سکے

اس لئے بہتر ہے کہ آپ

ایک اطلاعی کارڈ لکھ کر

اپنے لئے ایک جلد مخصوص کرالیں

قیمت کی اطلاع کتاب تیار ہونے پر دی جائے گی۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام - ریلسن روڈ - کراچی

پندرہ روزہ

کارزار

کراچی

ایک نئے ادب کا پیغامبر ہے۔

آنے والی صبح کی پہلی کرن ہے۔

سیاست اور ادب کا امتزاج ہے۔

نئی زندگی کے تقاضوں کا ترجمان ہے۔

کارزار کا مطالعہ آپکے ادبی ذوق کو تسکین دے گا۔

کارزار میں اشتہار دینا آپکے لئے منفعت بخش ہے۔

کارزار کے چند لکھنے والے ــــــــ

قیسی دلہر پوری - ماہر القادری - شان الحق حق - مجید لاہوری - حکیم عطاء الرحمٰن - عارف بٹالوی - اختر انصاری اکبرآبادی - کوکب شادانی - لیلیٰ لکھنوی - عارفہ بیگم - انجم مدنی - عابدی - حنیف فاروق - محشر - سہیل مرزا - شمس النسا - خالد عرفانی - ظفر آصف - صہبا اختر - تمکین جبلپوری - مونس تیموری - شان الحق حق - اصغر علی - سعید ساحر - اور دوسرے -

قیمت فی کاپی ۲ر   چندہ سالانہ نو روپے

منیجر "کارزار" کوریپ بلڈنگ - ڈونلی روڈ - کراچی ۲